(جملہ حقوق محفوظ)

مقالاتِ محمود

حصۂ اول

میر محمود حسین

لکچرر فارسی، جامعہ میسور

میسور

پوسٹ بکس نمبر 6556

اردو لائبریری سنٹر، ۷/۳۱ ہاسٹی مارکیٹ

بنگلور ۲

نیشنل فائن لیتھو پرنٹنگ ورکس

دیگر تصانیف

کلیاتِ نسیم میسوری:۔ بارِ اول ۔ سنٹرل پبلشنگ ہاؤز بنگلور
بارِ دوم ۔ اردو لائبریری سنٹر بنگلور

علامہ اقبال کی داستان دکن:۔ حیدرآباد اردو اکیڈمی، حیدرآباد

علامہ اقبال میسور میں :۔ اردو لائبریری سنٹر بنگلور

ریاستِ میسور کے اردو فارسی اور عربی کتبے ۔ ایک مطالعہ
(زیرِ طبع)

اردو لائبریری سنٹر ۷ ہسٹی مارکٹ
بنگلور ۔ ۲

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو اپنے والد ماجد

حضرت مولانا الحاج قاری ابو المظفر میر محمد حسین صاحب رح

(فاضل درسِ نظامیہ، سابق معلم، مہاراجا کالج و خطیب مسجدِ میمنان میسور)

کے نامِ نامی اسم گرامی سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

جنہوں نے

میری تعلیم و تربیت فرمائی اور مجھے وہ سب عطا فرمایا جو میرا سرمایہ حیات ہے
غفر اللہ لہ و نور اللہ قبرہ

خاک پا

میر محمود حسین

فہرست

	مضمون	شائع شدہ	صفحہ

پیش لفظ

(جناب پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب ام اے، ریڈر اردو، جامعہ عثمانیہ و مدیر سب رس، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، دکن)

اردو کو نصف صدی پہلے تک دہلی اور لکھنو کی حدود میں مقید کیا جاتا رہا، پروفیسر وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق نے اس کو ان حدود سے آزاد کیا اور یہ بتلایا کہ اردو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے، روزمرہ اور لب و لہجہ کا اختلاف چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔

اردو کا ابتدائی گہوارہ دراصل دکن کی سلطنتیں گلبرگہ پھر گولکنڈہ اور بیجاپور ہیں، جب ان حکومتوں میں زوال کے آثار پیدا ہوئے تو یہاں کے علما بھی منتشر ہو گئے، اور جہاں بھی وہ پہنچے علم کی توسیع و اشاعت میں مصروف رہے، چنانچہ ان کی وجہ سے مدراس، چنگل پیٹ، وانم باڑی، ویلور، سرا ارکاٹ، سدھوٹ، ادھونی، کڑپہ، کرنول، اورنگ آباد، سرینگ پٹن اور میسور وغیرہ اردو کے مراکز بنے اور یہاں عرصہ دراز تک مختلف موضوعات پر اردو میں کتابیں لکھی جاتی رہیں، لیکن جو شہرت ان مصنفوں اور ان کی تصنیفوں کو ملنی چاہیئے تھی نہ ملی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ سلطنتوں کا زوال حالات کی تبدیلی کا سبب بنتا اور عوام کو نفسی نفسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے اور اس طرح لوگ اپنے والوں سے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔

شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں سیاسی حالات زیادہ تغیر پذیر رہے ہیں، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کو مغلوں نے ختم کیا، اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں اور مغل صوبہ دار خودمختار ہوئے۔ انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزوں کی ریشہ دوانیاں اور رخنہ اندازیاں جاری رہیں۔ حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان شہید کی حکومتیں قائم ہوئیں اور مٹیں، لیکن علما اپنی مسندِ علم پر اور صوفیہ اپنے بوریوں پر بیٹھے خدمتِ خلق اور توسیع علم میں برابر مصروف رہے، ان کی درس گاہیں اور خانقاہیں علم و ہدایت کی مرکزوں کی حیثیت سے برابر کام کرتے رہے، اور نہ صرف یہ کہ ان میں آپس میں ربط باقی نہ رہا بلکہ ایک کو دوسرے کے کارناموں سے واقف ہونے کا بھی موقع نہ ملا۔

پچھلی ربع صدی میں جب تحقیقات کا شوق بڑھا تو ان مرکزوں میں جو شاندار علمی کارنامے انجام پائے وہ منظرِ عام پر آئے اور آتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ میسور کے ادیبوں کے کارناموں کے متعلق مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری نے لکھنا شروع کیا۔ پھر مقامی حضرات نے اس کا سلسلہ جاری رکھا اور تفصیلی روشنی ڈالنے لگے۔

جناب میر محمود حسین صاحب کی خدمات اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ آپ میسور کے ایک قدیم علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، آپ کے والد مرحوم مولانا ابوالمظفر میر محمد حسین جامعہ میسور کے ایک بلند مرتبت مولوی اور مسجدِ میمنان میسور کے خطیب و امام تھے، ان کا پیش کیا ہوا نفحات الانس جامی کا ایک قدیم ترین مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے، آپ کے نانا مولانا میر محمود مرحوم شعبہ مولوی و منشی ٹریننگ کالج، میسور میں مدرس تھے، ان دونوں بزرگوں کا نام میسور میں آج بھی زندہ ہے اور ان کے علم و فضل، تقدس و تقویٰ اور تعلیم و تبلیغ کا دینی اور علمی حلقوں میں بڑا شہرہ ہے، میر محمود حسین صاحب کی والدہ بھی ذی علم خاتون تھیں

نعت خوب کہتی تھیں اور سیدہ تخلص کرتی تھیں، میر صاحب نے علمی اور دینی ماحول

میں پرورش پائی اور جستجو اور تحقیق کا ذوق اپنے بزرگوں سے ورثے میں پایا، جامعہ

میسور سے فارسی میں ام، اے کیا، چند سال ٹریننگ کالج کے شعبہ مولوی و منشی میں

لکچرر رہے، پھر مہاراجا کالج آگئے اور چودہ پندرہ سال لکچرر کی خدمات انجام

دیں، اس کے بعد چھ سات سال سے پوسٹ گریجویٹ تعلیمات اور ریسرچ کے

شعبے میں فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نشرگاہ آکاش

وانی جب تک میسور میں رہی لگ بھگ بیس سال آپ وہاں اردو نشریات کے مہتمم

رہے اور قرآن مجید تفسیر کے ساتھ سناتے رہے، مہاراجا کالج کے دوران خدمت

میں آپ سالنامہ مخزن شائع کرتے رہے جس کے دو خاص شمارے "میسور میں

اردو نمبر" اور "ٹیپو سلطان نمبر" ملک بھر میں مشہور ہوئے اور ادیبوں سے کافی

داد پائی۔

میر محمود حسین صاحب کا ایک تحقیقی مقالہ "علامہ اقبال کی داستانِ دکن"

ماہنامہ سب رس میں شائع ہوا، اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس شمارے

کی ساری کاپیاں فروخت ہوگئیں اور راقم نے موصوف کی اجازت سے اس کو ایک

کتابچے کی شکل میں علیحدہ شائع کیا، یہ مقالہ بعض حضرات کے لئے رہنما بنا

اور مصنف کے لئے بھی باعث حوصلہ افزائی ہوا۔

میر محمود حسین صاحب اردو فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں

لکھتے ہیں، میسور کے مشہور و مقبول شاعر نسیم میسوری کا کلیات بھی مرتب کر کے

شائع کیا ہے جس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں، صاحب تذکرہ یادگار ضیغم نے نسیم

میسوری کا تذکرہ بڑی تعریف و توصیف سے کیا ہے اور ان کا فوٹو بھی شامل

کیا ہے۔ جو ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے

میر محمود حسین صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

جامعہ میسور کا اردو فارسی اور عربی مخطوطات اور نادر مطبوعات کا ذخیرہ ہے، آپ نے اطراف واکناف میں گھوم پھر کر سینکڑوں مخطوطات جمع کردئیے جامعہ میسور نے خود تین چار مرتبہ مخطوطات کے معائنے اور تحصیل کے لئے آپ کو مختلف مقامات پر بھیجا، مخطوطات کی فہرست بھی آپ نے تیار کردی ہے ان میں سے اکثر مخطوطات نہایت کارآمد اور بہت نادر اور قیمتی ہیں۔

اس مجموعے میں جو مضامین شامل ہیں وہ سب کے سب "سب رس" حیدرآباد، "برہان" دہلی، "صبح امید" بمبئی اور "مخزن" میسور میں شائع ہو چکے ہیں، ان کی اشاعت سے دکنی ادب کے مورخین سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان کی اصلاح ہوئی ہے اور بعض ایسے شعرا اور ادیبوں کو منظر عام پر آنے کا موقع ملا ہے۔ جنہیں تاریخ ادب میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔

مجھے توقع ہے کہ یہ مقالات دل چسپی سے پڑھے جائیں گے اور میسور کے ادیبوں اور ان کے کارناموں کے سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

چار قندیل۔ آغاپورہ۔ حیدرآباد

مورخہ ۳۰ ر اگست ۱۹۷۱ء

مفرّح القلوب

سلطان ٹیپو کے دور کی ایک اہم تصنیف

عہد سلطنتِ خداداد تاریخ میسور کا روشن ترین باب ہے، مخالفوں اور دشمن قوتوں نے گو اس کے آثار بڑی حد تک مٹا دیئے لیکن انہیں پوری طرح نیست و نابود نہ کرسکے۔ سرنگاپٹن کے کھنڈر اس سلطنت کی شان و عظمت اور جاہ و سطوت کی یاد دلاتے ہیں تو اس دور کے بچے کھچے مخطوطات اس کی علمی اور فنّی فتوحات کا پتا دیتے ہیں، اگرچہ یہ اڑتیس سال کا دور حکومت نہایت مختصر رہا اور نواب حیدر علی خاں بہادر اور ٹیپو سلطان شہید کے اکثر شب و روز میدانِ جنگ میں گزرے تاہم انہوں نے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور اہلِ علم و فن کی قدر شناسی اور ہمت افزائی سے کوئی غفلت نہ برتی، علما فضلا شعرا اور ادبا اطراف و اکناف سے کھنچ کھنچا کر ان کے دربار میں جمع ہو گئے تھے، سرنگ پٹن یا ظفر آباد علم و ہنر کا مرکز بنا رہا تو سلطنت کے دوسرے اہم مقامات پر بھی اہلِ علم اور اہلِ قلم مصروفِ عمل رہے۔ دونوں بادشاہوں نے دور دراز مقامات سے علما اور شعرا کو دعوت دے کر بلایا، ان کو وظیفے دئے اور انعام و اکرام سے مالا مال کیا اور دار الحکومت میں ان کی اقامت کا انتظام کیا، کہا جاتا ہے کہ

شمالی ہند کے علاوہ ایران اور عرب سے بھی اہل علم وہنر یہاں آکر جمع ہوگئے تھے، دہلی اور اودھ کے درباروں کے علاوہ ایران افغانستان اور حجاز کے بادشاہوں سے بھی ان دونوں بادشاہوں کے قلمی تعلقات تھے، حیدر علی خاں نے شیراز سے ایک ہزار سوار اپنی فوج میں بھرتی کئے تھے اور ایران کا ایک شہزادہ ٹیپو سلطان کے دربار میں دو سال مہمان رہا، حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان دونوں کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ مفتوحہ مقامات سے جو کتابیں حاصل ہوئیں اس کو اپنے شاہی کتب خانے بھجوا دیتے تھے، چنانچہ سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے ان کا کتب خانہ بھی مالِ غنیمت میں شامل کر لیا، اس کی وضاحتی فہرست سٹورٹ نے مرتب کر کے شائع کرائی تھی، اس نے سلطانی کتب خانے کی کتابوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ بتائی ہے، ان میں طب، تاریخ، شعر و ادب، لغات، فلسفہ، ریاضی، نجوم، انشا قصص، موسیقی وغیرہ پر عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مختلف اور متعدد مستند کتابیں شامل ہیں شاہی کتب خانے کی بعض کتابیں مذہب اور مطلا بھی تھیں اور اکثر بڑی اچھی نستعلیق کتابت میں مرقوم تھیں، ان کو بڑے اہتمام سے رکھا گیا تھا، سب کی چرمی جلدیں تھیں جن پر چاروں طرف خلفاء راشدین کے اسمائے گرامی، پیشانی پر، سرکارِ خداداد دی ہیچ ہیں۔ سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ۔ اور اس کے اوپر اور نیچے "اللہ کافی" کے نقش نہایت دیدہ زیب خط میں بنے ہوئے تھے اور جابجا شیر کی ببری کا نقش بنا ہوا ہوتا تھا جو گویا ٹیپو سلطان کا شاہی نشان تھا، کچھ کتابوں میں جو دربارِ سلطانی میں لکھی گئی تھیں سرنگ پٹن کے کارخانے کا کاغذ بھی استعمال ہوا تھا جس کا واٹر مارک یا آبی نشان بھی شیر کی ببری کا تھا، ایسے کاغذ اور ایسی جلدوں والے دو چار مخطوطات جامعہ میسور کے اورنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہیں، سلطان کی یہ بھی عادت تھی کہ اہم کتابوں کے متعدد نسخے تیار

کراتے اور انہیں افسروں اور دوستوں میں تقسیم کراتے تھے اور بطور تحفہ بھیجتے تھے

حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان دونوں کے درباروں میں ملک الشعراء کا تقرر ہوتا تھا اور دوسرے شاعر بھی موجود رہتے تھے جو خاص موقعوں پر قصیدے کہہ کر پیش کرتے تھے، حیدر علی خاں پڑھے لکھے آدمی تو نہیں تھے لیکن مختلف زبانیں جانتے تھے، ٹیپو سلطان کی باقاعدہ تعلیم ہوئی تھی، مختلف علوم وفنون سے واقف تھے، متعدد زبانیں جانتے تھے، فارسی میں کافی مہارت حاصل تھی، اکثر فارسی بولتے اور فارسی ہی لکھتے تھے، مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کرتے تھے، تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا، زمانہ مہلت دیتا اور جنگ وجدل سے فرصت ملتی تو شاید اس میدان کے بھی شہسوار نکلتے، سٹورٹ نے لکھا ہے کہ مختلف موضوعات پر سلطان نے سینتالیس کتابیں خود لکھیں یا اپنے درباری علما سے لکھوائی تھیں، بعض اوقات املا کرادیتے یا آپ کے حکم پر کوئی چیز لکھی جاتی تو اسے ملاحظہ فرما کر اصلاح کردیتے تھے، چنانچہ ایسی کتابوں سے آئینِ حرب وضرب پر فتح المجاہدین، نجوم پر زبرجد، فقہ میں فقہ محمدی، تاریخ سلطنتِ خداداد پر سلطان التواریخ، موسیقی پر مفرح القلوب اور خطبات جمعہ کا مجموعہ مویدالمجاہدین مشہور ومعروف ہیں، لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ سلطنتِ خداداد کی علمی پیداوار، اکثر وبیشتر تباہ وبرباد اور ناپید ہوگئی، شاہی کتب خانہ انگریز لوٹ لے گئے، مسلمان ایسے پریشان وہراساں ہوگئے کہ اپنے علمی سرمائے کی خاطر خواہ حفاظت نہ کرسکے، سلطان کے فرامین، خواب نامہ، ڈائریاں وغیرہ تک مالِ غنیمت میں گئے، جو سندیں وغیرہ افراد اور اداروں میں موجود تھے ان کو انگریزوں نے اپنے فرامین اور اسناد سے بدل ڈالا، اس طرح سے سلطنت کے آثار کو مٹانے کی مہم چلائی گئی۔ لیکن گذشتہ ڈیڑھ صدی میں کچھ چیزیں بازیافت ہوگئیں۔

اور ہاتھ آگئیں، تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں نے اپنی سعی و کوشش سے بعض اہم چیزوں کو منظرِ عام پر لایا۔ بہر طور ایک دھندلا سا نقشہ اس دور کی علمی اور فنی فتوحات کا ہمارے سامنے آچکا ہے تاہم یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے مکمل تصویر نہیں۔

دربارِ سلطانی میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے صرف فتح المجاہدین شائع ہوئی ہے باقی سب مخطوطات کی شکل میں انگلستان، پاکستان اور ہندوستان کی مختلف مخطوطہ لائبریریوں میں بکھری ہوئی ہیں، دورِ حاضر میں مائکروفلم کی جو سہولت ہوگئی ہے اس کی بدولت ان سب سے گھر بیٹھے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر شیخ علی صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (علیگ) پی ایچ ڈی (لندن) صدر شعبہ تاریخ جامعہ میسور نے سلطان کے سارے مکاتیب و فرامین کا مائکروفلم انگلستان سے منگا لیا ہے جن میں سے صرف چند منتخب خطوط کا ترجمہ کرک پیٹرک نے شائع کیا تھا اسی طرح ڈاکٹر خضر علی خاں صاحب ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (کنٹب) وظیفہ یاب پرنسپل مہاراجہ کالج و سابق پروفیسر اردو فارسی عربی جامعہ میسور کے پاس ٹیپو سلطان کے دستِ خاص سے لکھے ہوئے خواب نامے کا مکمل عکس موجود ہے جو آپ انگلستان سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ مفرح القلوب بھی دربارِ سلطانی کی ایک اہم تصنیف ہے جو توجہ کی مستحق ہے، اس کے نسخے مختلف مخطوطہ لائبریریوں میں بھی موجود ہیں اور ریاست میسور کے بعض ذاتی کتب خانوں میں بھی مل جاتے ہیں۔ ایک مکمل نسخہ جامعہ میسور کے اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی موجود ہے جہاں دکھنی، فارسی اور عربی کے لگ بھگ ہزار قیمتی مخطوطات کا ذخیرہ جمع ہوچکا ہے خود ٹیپو سلطان نے اس کے متعدد نسخے تیار کرائے اور تقسیم کئے تھے، چنانچہ کرک پیٹرک کے "منتخب مکاتیب سلطانی" کے ایک مکتوب سے بھی اس کا پتا چلتا ہے جس میں ٹیپو سلطان نے سری رنگ پٹن کے داروغہ توشک خانہ

شاہی کے نام حکم بھیجا ہے کہ مفرح القلوب کی دس نقلیں تیار کرا کے روانہ کی جائیں جن میں سے پانچ مکمل اور نقرئی جلدوں سے مزین ہوں اور پانچ فقط ملخص اور مختصر ہوں، نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے اپنی تصنیف یوروپ میں دکھنی مخطوطات میں رقم کیا ہے کہ انڈیا آفس لندن میں اس کتاب کے نو نسخے موجود ہیں جن میں سے بعض پر خود سلطان کے دستخط ثبت ہیں اور جو شاہی کتب خانے کے معلوم ہوتے ہیں، اپنے ایک تازہ مقالے میں جو رسالہ اردو کراچی کے جولائی ۱۹۶۶ء نمبر میں شائع ہوا ہے۔ آپ نے اس کے ایک اور نسخے کی نشان دہی کی ہے جو انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرہ مخطوطات میں شامل ہے، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کا ذکر ہاشمی صاحب نے اپنی مرتبہ فہرست میں کیا ہے

مفرح القلوب بھی فتح المجاہدین کی طرح دربارِ سلطانی کا ایک علمی، ادبی اور فنی شاہکار ہے اور ایک ثقافتی یادگار، عہد سلطنتِ خداداد کی بڑی گراں مایہ اور بلند پایہ پیداوار ہے، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے کئی مختلف پہلو ہیں، یہ اس زمانے کی درباری تصنیف ہے جب سلطنتِ خداداد کا عروج نقطۂ کمال کو پہونچ چکا تھا، ٹیپو سلطان کی ایجادی اور اختراعی صلاحیت اور رجحان کی آئینہ دار ہے، دربارِ سلطانی کی علمی اور ادبی فضا کا عکس اس میں دکھائی دیتا ہے۔ حسن علی عزت کا شاہ کار ہے، ان کا فارسی اور دکھنی نظم و نثر کا گویا کلیات ہے جسمیں انہوں نے انشا پردازی اور سخنوری کے جوہر دکھلائے ہیں سلطنتِ خداداد کی ادبی دکھنی زبان سب سے زیادہ اسی کتاب میں محفوظ ہے، فنی حیثیت سے موسیقی کے ادب میں ایک ممتاز اور دلچسپ اضافہ ہے۔ غرض یہ کتاب بہت سی خوبیوں کی مالک ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس پر اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مورخوں نے تو اس کا ذکر تک نہیں کیا، دو چار

تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے بھی تو اس کا صحیح تعارف نہیں کرایا، بلکہ بعض مقامات پر تو کچھ عجیب غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً نصیر الدین ہاشمی یورپ میں دکھنی مخطوطات میں رقم طراز ہیں کہ "کتاب کی ابتداء میں ایک طویل دیباچہ فارسی میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف عباد اللہ ہے نہ کہ حسن علی عزت، آخر پر تاریخ تصنیف ۱۱۹۹ھ مرقوم ہے" دیباچے کی اس عبارت سے دراصل ہاشمی صاحب کو مغالطہ ہو گیا" ہر چند ایں کم ترین عباد اللہ استعداد و قابلیت و طاقت حمل بارِ گراں ایں امر خطیر نداشت" ورنہ اس سے چار سطر پہلے ہی مصنف کا نام واضح طور پر یوں مرقوم ہے "حکم جہاں مطاع و عالم مطیع و بدیع محکم وامر قضا توام باضعف واحقر تمامی خلقت حسن علی المتخلص بعزت کہ یکی از خادمانِ حضور و بساط بوسان محفل نور علی نور است شرف صدور یافت" آپ نے بلوم ہارٹ کی عبارت کا خلاصہ بھی رقم کیا ہے جس کا اختتام اس بیان پر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۱۹۷ھ میں شروع کی گئی اور دو سال میں ختم ہوئی، یہ بھی غلط ہے کتاب کے آخر میں جو سال تاریخ ۱۱۹۹ھ مرقوم ہے دراصل شاہزادہ حیدر کی رسمِ ختنہ کے جشن کی تاریخ ہے اس موقع پہ کہے ہوئے تین فارسی قطعہ ہائے تاریخ کتاب کے آخر میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں کہیں سالِ تصنیف یا سالِ تکمیل مذکور نہیں ہوا، دیباچے میں ٹیپو سلطان کا سالِ جلوس البتہ ۱۱۹۷ھ مذکور ہے دیباچے کی عبارتوں سے اتنا ضرور واضح ہوتا ہے کہ اسی سال فتح المجاہدین تصنیف ہوئی اور اس کے بعد مفرح القلوب کی باری آئی، بہر طور یہ یقینی امر ہے کہ ۱۲۰۱ھ تک یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی کیونکہ اس سال سلطان نے اپنے مذکور فرمان میں اس کی نقلیں بھیجنے کا حکم دیا تھا، محمد سعید عبد الخالق نے میسور میں اردو میں اس کے متعلق صرف دو جملے لکھے ہیں، اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی وضاحتی فہرست، میں اسے غزلیات اور دوسری نظموں کا مجموعہ بتایا ہے

جو فارسی اور دکھنی میں ہیں اور اسے درباری شاعر حسن علی نے لکھا اور سلطان کے نام سے منسوب کیا، ڈاکٹر حبیب النساء بیگم (پروفیسر اردو جامعہ میسور) نے اپنے تحقیقی مقالہ میں جو ریاستِ میسور میں اردو کی نشو و نما کے نام سے شائع ہوا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۷۸۵ء میں یہ کتاب دکنی زبان میں لکھی جو اسی نام کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے" حالانکہ یہ کتاب فارسی میں ہے اور اس کی اکثر نظمیں دکھنی میں ہیں، یہ ترجمہ نہیں بلکہ تصنیف ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون صدر شعبۂ اردو جامعہ بنگلور نے ریاستِ میسور میں اردو میں اس کے فارسی دیباچے کا اقتباس پیش کیا ہے اور چھتیس ریختے، جن میں سے تیس قطعے ہیں اور چھ غزلیں، نو رباعیاں اور اٹھارہ فردیات نقل کئے ہیں، آپ نے لکھا ہے کہ "میں نے اس مجلے میں مفرح القلوب کا صرف اردو کلام مکمل طور پر شائع کر دیا ہے" آپ کے پیشِ نظر جو نسخہ رہا وہ شاید ملخص اور مختصر ہے، ورنہ اصل کتاب میں تو ان کے علاوہ ایک سو اسی غزلیں دکھنی میں مزید موجود ہیں

مفرح القلوب کے مصنف حسن علی عزت ہیں، سٹیوارٹ نے آپ کو ٹیپو سلطان کے دربار کا ملک الشعرا بتایا ہے، نصیر الدین ہاشمی نے اپنے آخری مقالے میں رقم طراز ہیں جو رسالہ اردو کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء میں فتح نامہ ٹیپو سلطان کے عنوان سے شائع ہوا ہے

عزت کا حال کسی قدیم تذکرے میں نہیں ہے، صرف کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کا بیان حسبِ ذیل ہے

"عزت تخلص، حسن علی نام، اس مصنف نے ایک تاریخ نظم میں فتوحاتِ ٹیپو سلطان کے کارناموں پر لکھی تھی اور اس میں لڑائی نظام علی خاں اور مرہٹہ وغیرہ کی بھی صراحت ہے، اس کا نام فتح نامہ ہے، اس کی ایک جلد سرکار کمپنی کے کتب خانے میں ہے۔"

عزت کے حالات زندگی وغیرہ اس سے زیادہ اور کہیں نہیں ملتے، البتہ مفرح القلوب کے دیباچے سے اتنی معلومات ضرور حاصل ہوتی ہیں کہ آپ سلطان کے دربار میں ایک معزز مصاحب اور شاعر کی حیثیت سے ممتاز تھے، سلطان نے آپ سے دو کتابوں کی تصنیف کا کام لیا، آپ خاص خاص موقعوں کے لئے قصیدے اور قطعے کہتے اور دربار میں سناتے تھے، آپ کی فارسی انشا پردازی کا کمال اور فارسی اور دکھنی کی شاعرانہ صلاحیتیں تو آپ کی تصانیف سے ظاہر ہیں، شاید موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے ورنہ مفرح القلوب کی تصنیف کے لئے سلطان آپ کا کیوں انتخاب کرتے، مذہباً شیعہ تھے مفرح القلوب کے دیباچے میں حمد و نعت کے بعد فقط حضرت علیؑ کی منقبت پر اکتفا کی ہے۔

مفرح القلوب کے دیباچے میں حسن علی عزت لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالب خود ٹیپو سلطان نے املا کرائے تھے، ان کا بیان ہے۔

"این کمترین ...... بمصداق کلام بلاغت ارتسام حضرت حافظ شیرازی قدس سرہ۔ بیت

در پس آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند ؛ ہر چہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

آنچہ از زبان گوہر بیاں ارشاد رفت شروع بتر قیم نمود"

بالکل اسی طرح کے بیان دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں جو دربارِ سلطانی میں تصنیف ہوئی تھیں، مثلاً فتح المجاہدین کے دیباچے میں میر زین العابدین شوستری بھی یہی لکھتے ہیں، نشانِ حیدری کے مصنف کرمانی تو اسے خود سلطان کی تصنیف شمار کرتے ہیں، سلطان التواریخ کے مصنف نے لکھا ہے۔

"بر اربابِ بصیرت پوشیدہ نماند کہ اکثر عبارات کہ بصفت خیر الکلام ما قلّ و دلّ موصوف است از زبان گوہر فشاں آں جناب است"

دربارِ سلطانی میں مرتب کی ہوئی ایک اور کتاب فقہ محمدی کے

کے دیباچے میں تحریر ہے کہ "پس بموجب حکم قضا توام بحضور حضرت محلی الکمال این رسائل کردہ شد باین وجہ کہ عبارت ہر مسئلہ وصورت استنباط آں از مسائل مختلط از حضور ارحم الفضلاء بمولویان مذکورہ ارشاد می شد ایشاں بعینہ بقید قلم می آورند تا یحدی کہ بانجام رسید و نام این کتاب بفقہ محمدی موسوم گردید"

یہ کتاب حنفی فقہ کے روزمرہ کے مسائل کا مختصر مجموعہ ہے اور اس کا سلطانی کتب خانے کا ایک نسخہ ہماری جامعہ کے اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ ہے

یہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ٹیپو سلطان نے خود املا کرائی تھیں یا ایسے بیانات صرف ان کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لئے رقم کئے گئے ہیں سلطان کے علمی ذوق اور تخلیقی صلاحیت سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، ان کی تعلیم باقاعدہ اور اچھی ہوئی تھی مطالعہ وسیع تھا، مکاتیب فرامین وغیرہ اکثر اوقات دست خاص سے لکھتے تھے، محفلوں میں سلاطین عرب وعجم کے واقعات، آیات قرآنی، اور احادیث رسول وغیرہ کا بیان ہوتا رہتا تھا ان سب حقائق کے باوجود مفرح القلوب اور ان دوسری کتابوں کا اصل مصنف آپ کو قرار نہیں دیا جاسکتا، آپ کی خاص تحریروں اور ان کتابوں کی عبارتوں میں واضح فرق ہے، البتہ اتنا ضرور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ تحریک اور تجویز آپ فرماتے تھے، خاکے بھی آپ ہی دیتے تھے، باقی خانہ پری، ترتیب اور تکمیل درباری علماء اور شعراء کرتے تھے، چنانچہ مفرح القلوب کا بھی یہی حال ہے۔

مفرح القلوب کے علاوہ حسن علی عزت کی ایک اور تصنیف بھی موجود ہے جو فتح نامہ ٹیپو سلطان یا اضراب سلطانی کے نام سے موسوم ہے، اس میں آپ نے ٹیپو سلطان کے ایک معرکے کا حال دکھنی نظم میں لکھا ہے

جب سلطان نے نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کی متحدہ قوت کو شکست فاش دی تھی، عزت نے یہ جنگ نامہ خود سلطان کے حکم پر لکھا تھا، ہاشمی صاحب نے اسے مکمل طور پر رسالہ اردو کے اس مقالے میں شائع کر دیا ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

مفرح القلوب بنیادی طور پر فارسی کتاب ہے کیونکہ اس کا دیباچہ اور دوسرے مطالب کا بیان فارسی نظم و نثر میں کیا گیا ہے، لیکن بعض مطالب کا بیان زیادہ تفصیل اور طوالت کے ساتھ دکھنی نظم میں ہوا ہے، اور دکھنی نظمیں فارسی نظموں سے تعداد میں دس گنی زیادہ ہیں، تاہم اس کا دکھنی حصہ الگ کر لیا جائے تو ایک مبہم سی چیز رہ جاتی ہے، کیونکہ اصل بنیادی مطالب کا بیان فارسی میں درج ہے، لسانیاتی نقطۂ نظر سے دکھنی حصّے کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے، یہ گویا سلطنتِ خداداد کی دکھنی شاعری کا سب سے بڑا اور بڑی حد تک نمائندہ مجموعہ ہے، فنی حیثیت سے فارسی اور دکھنی دونوں حصوں کی اہمیت مساوی ہے، یہ ایک مبسوط کتاب ہے جس کا موضوع موسیقی اور رقص ہے، یہ نہ ہندوستانی موسیقی معلوم ہوتی ہے نہ کرناٹکی، اسے سلطانی موسیقی کہنا بجا ہوگا، کیونکہ اس کی ایجاد کا سہرا ٹیپو سلطان کے سر ہے۔ فنِ موسیقی کے ماہر اس کا تقابلی مطالعہ کر سکیں گے اور صحیح اندازہ لگا سکیں گے، اس کا آغاز سلطان کے دربار سے ہوا اور زوالِ سلطنت نے اسے بھی ناپید کر دیا، سُر تال، او ونچ نیچ کے قواعد و اصول اس میں بڑی صراحت اور اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، نغموں اور رقص کی بنیاد اوزان پر رکھی گئی ہے اور اوزان کے لیے افاعیل کا استعمال کیا گیا ہے، بہر طور جو کچھ بھی ہے ایک مسلسل اور مربوط نظام ہے، یہ بھی ٹیپو سلطان کی ایک ایجادی اور اختراعی یادگار ہے آپ نے جہاں سنہ محمدی یا مولودی کو رواج بخشا شہروں اور

گاؤوں کے نام بدلے، ہتھیاروں، پیمانوں وغیرہ کو نئے ناموں سے موسوم کیا وہاں اپنی جدت پسندی سے کام لے کے اصولِ موسیقی بھی وضع کیئے احکامِ شرع کی پابندی بڑی مستعدی کے ساتھ کرتے تھے لیکن محض تفننِ طبع اور تفریحِ خاطر کے مقاصد سے گاہے ماہے گانا سنتے اور رقص دیکھ لیتے تھے

کتاب کا آغاز تسمیہ سے ہوتا ہے اور اس کے مضامین مقدمہ، چھ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہیں، حمد و نعت میں عزت نے اپنے کمال انشا پردازی کے جوہر دکھلائے ہیں، کچھ عبارتیں بطورِ نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

" حمد صانعی کہ چوں آفتابِ جہاں تاب صبح صنعتش از افقِ مشرق اِذَا اَرَادَ اللّٰہ شَیْئاً اَنْ یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ طلوع نمودہ غنچہ ہائے دل اربابِ نشاط و طرب را برنگ گل شگفتگی بخشید و شعلہ کار لطفش بفحوای زینا السماء الدنیا بمصابیح چراغ خورشید و شبستان عالم کون و فساد افروختہ فانوس قلب اہلِ مسرت و بہجت را بنور ضیائی قدرتِ کاملہ خویش ابیض و منور گردانید نخل بندی کہ بلبل را از آتشِ عشق گل سراپا سوختہ در گلستان رنگ و بوی الفت بسان بسمل پہلو بہ پہلو طپانید۔

ای بر کمال قدرت تو عقل کل گواہ ٭ بر لوح کبریائے تو توقیع لا الہ
از شبنم عطائے تو یک قطرہ بحر و کاں ٭ وز پرتو جمال تو یک ذرہ مہر و ماہ
بر باد تست عیش جوانان میکدہ ٭ وز شوق تست نعرہ پیرانِ خانقاہ
عزت کہ نامہ عملش را بنا مدہ ٭ عنوان بغیر مطلع مضمون بجز گناہ

عالی ترین جواہر صلوات مسرت آیات والاترین لالی تحیات بہجت سمات نثار جناب نبوت انتساب محمد مصطفیٰ خاتم الانبیاء صلوٰۃ اللہ و سلام اللہ علیہ و الہ الطیبین و الطاہرین و اصحابہ

ای بردہ زآفتاب بوجہ حسن سبق ٭ ظاہر شد از تبسم تو صبح در شفق
از سرو خوش خرام تو شمشاد منفعل ٭ وز روی لالہ فام تو گل برگ در عرق
از دفتر جمال تو توریت یک رقم ٭ در مصحف کمال تو انجیل یک ورق
عزت و نعت ذات تو فی السر والعلن ٭ چنداں کہ ہست ناطقہ را قوت نطق

حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت بڑے خلوص اور عقیدت سے کرتے ہیں اس کی کچھ عبارت اور ابیات ہدیہ ناظرین ہیں

مدح منقبت شاہنشاہیت کہ طناب سرادق اجلال و شوکت و حشمت و عزت و رفعتش قاف تا قاف ہستی کشیدہ و صدائے صیت فضائل و کمال وجود ستائش در گنبد طاق گنبد خضرا پیچیدہ ۔۔۔

علی صورت قدرتِ کردگار ٭ علی در جہاں حجت استوار
ہوا خواہ او جبرئیل امیں ٭ بفرمان او آسمان و زمین

اس کے بعد اصل موضوع کا بیان یوں شروع کرتے ہیں ۔

"اما بعد بر آئینہ دلہائے اولو الابصار ظاہر و روشن و بر مرات خاطر ارباب فطنت و ذکا ہویدا و مبرہن است کہ از بدو فطرت الی الآن اکثر پادشاہان ذی شان در اکثر ازمنہ و اعصار فرمان روایان ذوالاقتدار بودند۔ احدی را غیر از خور و خواب و لہو و لعب و بیہودہ گوئی اشتغال امر دیگر نبود ۔"

دیباچے کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے

ابتدائے آفرینش سے اب تک دنیا میں بہت سے بڑے بڑے بادشاہ دنیا میں گذرے لیکن انھوں نے اور ان میں سے خاص طور پر ہندوستان کے بادشاہوں نے فضولیات میں عمر بسر کی اور عموماً لہو و لعب، خورد و خواب، عیش و عشرت، نشاط و انبساط، سیر و شکار، حسن

وعشق اور شرب وشراب میں مشغول رہے۔ آئین فتوح وسلطنت اور قواعد
جہاں گیری پر انہوں نے شاذ ونادر ہی توجہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رشتہ ریاست
وخلافت ان کے ہاتھ سے جاتا رہا، بے دین نصاریٰ ان کی سلطنت پر قابض
ہوتے چلے گئے، ان کے آلات وہتھیار سے شاہان ہند خوف زدہ ہوکر ان کی
خوشامد اور چاپلوسی کرنے لگے، چنانچہ نصاریٰ نے مساجد کو ڈھا دیا اور اپنی
عبادت گاہیں تعمیر کرتے چلے گئے، لیکن ٹیپو سلطان نے اس حقیقت کو بخوبی
سمجھ لیا اور ان سے جہاد پر کمربستہ ہوگئے، ان کو ہر معرکے میں نیچا دکھایا، وہ
قتل ہوئے یا راہِ فرار اختیار کی یا آپ سے امان مانگ لی ۱۱۹۷ھ میں
تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے آئین حرب و
ضرب اور قانون جنگ وجدل پہ فتح المجاہدین نامی کتاب ترتیب دی جو
ایک نادر الوجود کتاب اور اپنی نظیر آپ ہے اس کے علاوہ بھی آپ نے اور
بہت سے ایجادات اور اختراعات کئے، امور مملکت سے فارغ ہوئے تو
آپ نے موسیقی کے قواعد واصول از سرِ نو مرتب کئے کیونکہ جس طرح جسم و
جان لازم وملزوم ہیں حرب وضرب کے ساتھ تفریح وتفنن اور مسرت وبہجت
بھی لازمی اور ضروری ہیں۔ چنانچہ آپ نے مفرح القلوب کے نام سے یہ
کتاب قید تحریر میں لائی، زمان سابق میں کشن نامی ایک شعبدہ باز گزرا ہے
جو کبھی عورت کی شکل اختیار کرتا کبھی مرد کے بھیس میں آتا، کبھی بچہ، کبھی جوان
اور کبھی بڈھا بن کر آتا، اس نے جو اصول موسیقی وضع کئے تھے وہی سارے
جہاں میں مشتہر اور مروج ہوگئے، کسی نے ان پر تنقیدی نظر نہ ڈالی تھی
اگرچہ وہ بے لطف اور لذت سے خالی تھے، مگر ٹیپو سلطان نے اپنی جدت
پسندی سے کام لے کر ان کا رنگ ہی بدل ڈالا، آپ نے سازوں کا تعین کیا،
چھ نغمے ٹھہرائے بارہ ضربیں اور نشیدیں مقرر کیں اور نئے اصول وضع کئے،

نغموں کے نام آفتاب کے مختلف رنگوں اور حالتوں کے ناموں پر رکھے

اس کے بعد مختلف سازوں کا تعارف اور تفصیلات فارسی نظم ونثر دونوں میں بیان کئے گئے ہیں جیسے مردنگ، زنگولہ، صدر، ہلال بدر، وغیرہ ان میں سے اکثر کو عزت ٹیپو سلطان کی ایجاد اور اختراع بتاتے ہیں اس مقدمے کے بعد چھ باب قائم کئے گئے ہیں اور ہر باب میں پہلے فارسی نثر میں ایک نغمہ یعنی راگ کا بیان کیا گیا ہے پھر اس کے قواعد فارسی نظم میں بیان کئے گئے ہیں جیسے "غزل گوشوارہ" کا عنوان دیا گیا ہے، اس کے بعد ایک سلامیہ رباعی دکھنی میں رقم کی گئی ہے اور دکھنی نظم میں اس نغمے کی کچھ اور توصیف کی گئی ہے، ہر نغمے کے پانچ اصول قرار دئے گئے ہیں اور پانچوں کا بیان دکھنی نظموں میں مرقوم ہے آخر میں تین دکھنی غزلیں اور دو فارسی غزلیں جو اس نغمے کے لئے موزوں ہیں پیش کی گئی ہیں جو سب کی سب عزت کی کہی ہوئی ہیں، البتہ ہر دکھنی غزل کے بعد اسی کے وزن میں کسی فارسی شاعر کا ایک شعر لایا گیا ہے جسے عزت "جملہ معترضہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور ہر فارسی غزل کے بعد اپنی ایک دکھنی بیت لائی ہے، ہر باب میں نغمہ و اصول کے بیان کے ساتھ ہی ساتھ بارہ ضربوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں چھ نشست سے مخصوص ہیں اور چھ رقص سے متعلق :

خاتمے میں مزید سلامیہ رباعیاں، فارسی اور دکھنی غزلیں، متعدد ضروریات منسلک ہیں جن کے مضامین بقول مصنف بہاریہ اور ثنائیہ ہیں آخر میں رقص کے مزید قواعد و آداب کا فارسی نثر میں بیان کیا گیا ہے کتاب کا اختتام تین فارسی قطعوں پر ہوا ہے جو شاہزادہ حیدر کے جشن رسم ختنہ کے موقع پر مخصوص راگوں میں گانے کے لیے کہے گئے ہیں، ان میں تاریخی مادے شامل ہیں جن سے سال ۱۱۹۹ھ حاصل ہوتا ہے، شاید انہیں سے مغالطہ ہوا ہے کہ یہ

کتاب کا سال تکمیل ہے۔
ساری کتاب میں جملہ نظموں اور ابیات کی تعداد حسب ذیل ہے
فارسی قطعے ۵۰، فارسی غزلیں ۱۵۰، فارسی رباعیاں ۲۰، فارسی فرد ۱، دکھنی قطعے ۳۰، دکھنی غزلیں ۱۸۶، دکھنی رباعیات اور قطعات ۲۵، دکھنی فردیات ۳، دکھنی ابیات دو ہزار، جملہ فارسی ابیات تقریباً ساڑھے چار سو، جملہ معترضہ لقب والے فارسی اشعار کے علاوہ سارا منظوم کلام عزت کا ہے، گویا آپ کا دیوان ہے، رباعیاں کم ہیں لیکن چار مصرع والے قطعوں کو بھی رباعی کا نام دے دیا گیا ہے، دکھنی کو ہندی بھی کہا ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا ہر جگہ دکھنی نظم کو ریختہ کہتے ہیں، خود مصنف کے قول کے مطابق ساری غزلیں بہاریہ اور ثنائیہ ہیں، سارے مضامین طربیہ ہیں، حزن و ملال اور یاس و حرماں کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا، بہاریہ اور عاشقانہ مضامین کے پہلو بہ پہلو سلطان کی مدح و ثنا کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ غزلیں سلطان کے سامنے گانے اور رقص کرتے ہوئے سنانے کے لئے لکھی گئی ہیں، مختلف راگوں کے لئے موزوں اوران سے مخصوص ہیں، ان کا مقصد تفریح و تفنن کے سوا کچھ نہیں، کتاب کا نام اپنے موضوع اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے اسم با مسمیٰ ہے اسلاست، روانی، حسنِ بیان اور اثر آفرینی عزت کے فارسی اور دکھنی کلام کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ نغموں کا مختصر سا تعارف حسب ذیل ہے

۱۔ ابیض۔ صبح کا نغمہ، اس کے پانچ اصولوں کے نام سحر کے پہلے حرف سے نکلنے والے رکھے گئے ہیں یعنی سلطانی، سرو شاہی، سرو نازی، سبزواری اس کی غزلوں میں تعریف صبح، حسنِ محبوباں، شگفتن گل، روشنی، مجلسِ شادی شجاعت، سخاوت، عدالت اور حسن کی تعریف کے مضامین آئے ہیں

۲۔ اصغر۔ چاشت کا نغمہ جب آفتاب کی روشنی زردی مائل ہوتی ہے اس کے

پانچ اصولوں کے نام جیم عربی سے نکلنے والے رکھے ہیں یعنی جان فزائی، جشنِ شہنائی جعد مشکی، جادو لحنی اور جان دل کشائی ۔ اس باب کی غزلوں کے مضامین آفتاب چاشت کی تعریف، زرد پھولوں اور زعفرانی لباسوں کی توصیف، گل و گلزار وغیرہ پر مشتمل ہیں

۳ ۔ احمر ۔ وقت نصف النہار کا نغمہ جب شمس سمت الراس پر آتا ہے اور اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے، چنانچہ اس کے پانچ اصول کے نام شین سے نکلنے والے مقرر کئے گئے ہیں ۔ یعنی شہنشاہ پسندی، شاخ گلی، شاہانی، شوخ و شنگی اور شیریں، اس باب کی غزلوں میں سرخ پھولوں، گلرو معشوقوں اور شجاعت سخاوت اور عدالت کا وصف بیان کیا گیا ہے ۔

۴ ۔ زبرجد ۔ عصر کے وقت کا نغمہ جب کائنات پر سبز رنگ غالب ہوتا ہے اس کے پانچ اصولوں کے نام عین سے نکلنے والے اختیار کئے گئے ہیں یعنی عشق آہنگی عروسی، عشاق پسندی، عشق افروزی اور عشق انگیزی، اور اس سے متعلق غزلوں میں یہ مضامین آئے ہیں، گل و ریحان و بستان لباس ہائے سبز رنگ گلرخاں، مجلس محبوباں، بہار وصف شجاعت و سخاوت و عدالت و حسن و ملاحت

۵ ۔ ورد ۔ شام کا نغمہ جب آفتاب کا رنگ گلابی ہوتا ہے، مغرب کی میم سے نکلنے والے پانچ نام اس کے پانچ اصولوں کو دئے گئے ہیں یعنی مہر افزائی، ماہ نوی مہر آہنگی، مہر انگیزی اور محفل افروزی اور اس کی غزلوں کے مضامین سرخی شفق گلابی پھولوں، محبوبوں کے گلابی رنگ، بہار ۔ روشنی، آتش بازی، مجلس آراستہ کیاست، شجاعت سخاوت، عدالت وغیرہ پر مشتمل ہیں ۔

۶ ۔ عباسی ۔ شب کا نغمہ، جب سارے عالم پر کبودی رنگ چھایا ہوتا ہے نصف شب کے نون سے نکلنے والے ان پانچ ناموں سے اس کے پانچ اصولوں کو موسوم کیا گیا ہے نقش گلی، نقش جہانی، نورسی، نقش عاشقی اور نقش دلی، اس باب میں جو غزلیں لائی گئی ہیں ان میں عام طور پر مضامین باندھے گئے ہیں

گل نافرماں، نافرمانی رنگ اور لباس اور معشوقوں کے اس رنگ کی تعریف چراغاں و آتش بازی، ماہ چہار دہم کا حسن، شجاعت، سخاوت، عدالت فرش و لباس مہتابی وغیرہ

بارہ ضربوں کے نام حسبِ ذیل ہیں، جیپر، ادمن، ادوائی، جوسق، اصول فاختہ، جت، تہاچیرہ، جیرہ تہم، چرخ زن، روادہ، سمن، پہلی چھ ضربیں نشست سے متعلق ہیں اور آخری چھ رقص سے مخصوص۔

عزت نے دیباچے میں ٹیپو سلطان کے لیے مقفیٰ مسجع آداب و القاب استعمال کئے ہیں اور بڑی تعظیم سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں

حضرت سلطان، خلیفۃ الرحمٰن، خاقان ابنِ خاقان، ظل الطاف خلاق ارض وسما، زیب اورنگ سلطنت وجہاں بانی، مسند نشین چار بالش حکمرانی، فروِ زندہ چراغ عدل وداد، سوزندہ خرمن ظلم وفساد، مجموعہ مکارم اخلاق وشیم، شیرازہ صحیفۂ نظام عالم ہشید اساس احتشام، پشتیبان بنائے دین اسلام، آفتاب سپہر دولت واقبال، سایہ رحمت حضرت ذوالجلال۔

جہاں داور و دادگر شہریار	خدیو زماں رحمتِ کردگار
ز دیوان عدل شہ کامراں	یکیں سطر زنجیر نوشیرواں
بہر کشوری صیت آں سرفراز	بود سجدہ فرما چو بانگ نماز

خلد اللہ ملکہ واقبالہ وسلطنتہ

لیکن ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک کے بادشاہوں پر جو تنقید کی ہے وہ یا تو تاریخ سے لاعلمی کا اظہار ہے یا اپنے سلطان کی مبالغہ آمیز قصیدہ گوئی، ہندوستان میں اور بھی چند بیدار مغز بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے آئین حرب وضرب اور قانون سلطنت ومملکت کی ترتیب وتسطیر پر توجہ دی ہے، یہ اور بات ہے کہ ٹیپو سلطان چند خاص اور امتیازی خوبیوں کے مالک تھے

حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان شہید دونوں پر بیجاپوری تمدن کا بہت اثر تھا، چنانچہ ان کی عمارتیں بیجاپوری طرز تعمیری کا رنگ لئے ہوئے ہیں کہا جاتا ہے کہ حیدر علی خاں نے دار الخلافہ سری رنگ پٹن کا لال باغ بیجاپور اور سرا کے باغوں کی طرز پر بنایا، ٹیپو سلطان نے مسجدِ اعلیٰ بنائی تو اس کے لئے بیجاپور سے نقشہ منگایا، اسی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے مفرح القلوب لکھوائی تو اس کی تحریک .... دراصل ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس سے ہوئی ہے، اس کا ایک نسخہ سلطان کے ذاتی کتب خانے میں بھی موجود تھا، آپ نے اس کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا اور وہیں سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا جو بعد کو مفرح القلوب کی صورت میں جلوہ نما ہوا۔ کتاب نورس اس کے مقابلے میں مختصر ہے، اس میں کوئی ایجاد یا اختراع تو نہیں اس میں جملہ ۱۷ راگوں کے لئے ۵۶ گیت اور ۱۷ دوہرے خود ابراہیم عادل شاہ کے کہے ہوئے ہیں لیکن ان کی زبان کہیں سادہ اور کہیں مشکل ہے، وہ فارسی یا دکھنی کی کسی صنف کے ذیل میں نہیں آتی اور نہ ان کو اور دکھنی نظموں کی طرح فارسی عروض کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے، لیکن ان میں ابراہیم عادل شاہ نے اپنے شاعرانہ کمال کے جوہر دکھلائے ہیں جن کی بدولت اس کتاب کا ادبی مقام بہت اونچا ہے، اسے ملک قمی اور ظہوری کے دیباچے بھی میسر آئے، بہر طور کتاب نورس اور مفرح القلوب کا مقابلہ اور موازنہ بہت پر لطف ہوگا

مفرح القلوب کی اہمیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ عہد سلطنتِ خداداد کی دکھنی شاعری اور زبان کا ضخیم ترین اور نمائندہ مجموعہ ہے۔ یہ وہ دکھنی ہے جو ٹیپو سلطان کے دربار میں رائج تھی اور اس دور کے کسی اور شاعر کا دکھنی کلام اتنی مقدار میں نہیں ملتا، شاہ عارف کی مثنوی حقوق السلمین اس سے زیادہ ضخیم ہے مگر وہ ۱۲۲۴ھ کی پیداوار ہے اور اس میں رنگ تغزل نہیں، محمد علی خانہ زاد کے

مجموعہ قصائد دکھنی گنج شائیگان میں تین ہزار ابیات ہیں مگر وہ سب کے سب بزرگان دین کی مدح و منقبت میں ہیں اور اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۲۱ھ ہے خانہ زاد نے باقر آگاہ کے جواب میں آٹھ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن غزل میں ان کا رنگ نہیں جمتا عزت کی غزلوں کی حیثیت منفرد ہے، عارف اور خانہ زاد کے مقابلہ میں عزت کے یہاں دکھنیت زیادہ ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس دور میں شمال کی اردو اور جنوب کی دکھنی میں یہاں ایک کشمکش جاری تھی، اس دور کی زبان گول کنڈہ اور بیجاپور کی زبان کے مقابلہ میں کچھ جدید معلوم ہوتی ہے، اسے دراصل دکھنی کا دور متاخرین کہنا بجا ہوگا۔ رفتہ رفتہ یہاں اردو نے دکھنی کی جگہ لے لی۔ اگرچہ بول چال میں دکھنی ہی عام طور پر رائج ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مفرح القلوب کے مصور نسخے بھی تیار کرائے گئے تھے دیباچے میں بھی اس کا ذکر یوں موجود ہے۔

نام نغمہا می شش گانہ وسی اصول آنہا دوازدہ ضرب و نشید وغیرہ کہ بہ تفصیل در نظم ذکر آں خواہد شد باسامی دل چسپ و فرحت افزا و تصاویر دل کش و طرزہای دل کشا زینب فرمودند"۔ ہمارے پاس جو نسخہ ہے اس میں کوئی تصویر نہیں، اس کی تحقیق کی جانی چاہیئے۔

حسن علی عزت کی ایک فارسی غزل اور چند منتخب دکھنی غزلیں بطور نمونہ پیش کر کے میں یہ مقالہ ختم کرتا ہوں۔

فارسی

زلبس چوں لالہ می سوزو گل از روی تو گلشن ہم
چمن پر آتش تہمت دود ش سرو سوسن ہم
بیا ای آرزوی جاں کہ شوق دیدنت دارد
دل پرہیزگار و دیدۂ پاکیزہ دامن ہم

شگاف سینہ گر تیغ تو افتد کسی دوزد
بہ پیچید رشتہ بر خود خوں فشاند چشم سوزن ہم

خیال تار زلفت چوں شب و رخسار چوں روزست
شب تاریک در چشم منست و روز روشن ہم

بقصد کشتن من می کشاید ناوک و من خود
ہلاک ناوک و حیران روی ناوک افگن ہم

بسان سایہ دار و آفتاب از شوق دیدارت
زوری آید و می افگند خود را ز روزن ہم

زہی دولت کہ چوں جولاں کناں آں شہسوار آمد
کشم خاک رہش در چشم و بوسم فعل توسن ہم

نمی دانم چہ سازم چارہ کار ای مسلماناں
کہ از نادیدن آں روی می میرم ز دیدن ہم

مدام عزت خیالی دیدن روی تو می دارد
نبودہ بت پرستی ہیچو او ہرگز برہمن ہم

(دکھنی - جملہ معترضہ)

چمن پیرای عشرت ہے مرا سلطان جم حشمت
ہزاراں گلرخاں بلبل ہو کرتے اسکے تئیں خدمت

دکھنی

(سے) باغباں اب سرسیں تم گلشن کے زیبائی کرو
برگ گل سے سب چمن میں فرش آرائی کرو

(ہر) قمریاں بھی سرو کے منبر پہ آ کر نادعا

بلبلاں سب تہنیت سوں مدح پیرائی کرو (ے)

سنفد نیساں بھی یکسر آب پاشی کرہیں
گلعذاراں گلستاں کی اپنی رعنائی کرو
مے سے عشرت کی بھی جام لالہ سب بھر کر رکھو
نہر پر سبزی ستی پھر تازہ بینائی کرو (ے)
نازنینانِ چمن اس یوسفِ ثانی اوپر
سیم و زر اپنا تصدق کر زلیخائی کرو
قصد رکھتے ہیں مرے سلطان سیر باغ کا
اون کی تشریف آوری سوں رونق افزائی کرو (ے)
(ے) اے شہنشہ باغ سب پژمردہ ہے تم شوق سوں
جا نسیم فیض بخشی سوں مسیحائی کرو (ے)
طوطیاں عزت صفت ہی شہہ کی جا کر بزم ہیں
وصف عدل و داو سوں تم نغمہ پیرائی کرو (ے)

جملہ معترضہ
گر نہ عزم سیر باغ آں ترک تیر انداز کرد
مرغ رنگ آشیان گل چرا پرواز کرد

شمع جلتا ہے شہنشاہ کے انوار کو دیکھ
زاہد گریاں ہے تمہیں چہرہ کی جھلکار کو دیکھ (انہار)
مے کے پینے سے مجھے کیفیت نشہ نہیں
تاک پیچیدہ ہے مجھ عاشق سرشار کو دیکھ
قیس فرہاد کہاں اون سے یہ بولوں احوال
یار عیار ہوا مجھ ستے اغیار کو دیکھ (ے)
ایک دن وہ گل خوں ریز کیا سیر چمن
بلبل آشفتہ ہوا اس گل گلنار کو دیکھ
رستم و سام و نریماں کریں پہلو خالی
خونچگاں حضرتِ سلطان کی تلوار کو دیکھ
اسپ کی کیا کروں تعریف وہ ہے مثل جبال
یا ورہتا ہے عقب تیزی رفتار کو دیکھ

(ہاتھوں) شاعراں لوح و قلم ڈال دئے ہاتوں سے آج عزت کا زبس خوبی اشعار کو دیکھ

فوج کیں موج تو از حصر کواکب افزوں
گنج بے حصر تو چوں گنج مشیت مشحوں

دست ہیں اب چرخ کے مہ کا بلوریں جام ہاہے
مے پرستاں بادہ نوشی کا یہی ہنگام ہاہے
(سے) نور بخشی یک نگہ سیں اس سبب دل پر کرو
خدمت عالی ہیں شہ کے مہ کا یہ پیغام ہاہے
ماہتابی پوش اہل بزم ہیں حور و قصور
جنت الماوٰی بجا محفل کا شہ کے نام ہاہے
(پر) کیا مجال عقل ہے کر با نظر چہرے پو تم
مہر و ماہ و اختراں بہ حسن کا احتشام ہاہے
مشتری زہرا عطارد پاس دے زر و گہر
ساتن لے آیا تصدق واسطے بہرام ہاہے (ساتھ)
کیا صفائی روشنی اور ہے ہوا محفل کے بیچ
چشم روشن لب ہے خنداں دل اوپر آرام ہاہے
(سے) حکم سلطاں پر ہنوں عزت سوں کیوں پر آب شعر
گوہر شہوار مضموں کا اسی انعام ہاہے

جملۂ معترضہ
دہ کہ گر من باز بینم روی یار خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

کبھی سر پر کبھی دل پر کبھی چشماں ہیں جا کرتا

غبار راہ جولاں شہ کا کیا کیا کار ہا کرتا
جو کوئی ہو شمع سا سرکش مقابل بزم میں آوے
بیک جنبش اسے خاموش کر کر سر جدا کرتا (کرکے)
مثال برق گر سلطاں صف دشمن اوپر چمکے
عدو کا خرمن ہستی جلا کر طوطیا کرتا
نہیں یارا کسی مشرق سوں مغرب لگ کہ سد ہووے
ہر جانب بطرز مہر گر عطف لوا کرتا (تک)
میان جنگ عدو گر تیغ کوں دیکھ الاماں چاہے
تب اپنے فضل اور رحمت سوں اوس کوں جاں عطا کرے (سے)
کروں کیا وصف میں شہ کی سخاوت اور شجاعت کا
ہے رستم طفل مکتب اور حاتم دست وا کرتا
مہ و خورشید ساعت کف دست دعا وا کر
دعائے فتح و نصرت ہر صباح و ہر مسا کرتا
مپیچ زلف بعارض کہ کار دل بجاں افتد
جملۂ معترضہ
مکن ور دیدہ لب شیریں کہ شوری در جہاں افتد

(سے) تمہارے چشم مستاں سیتی خماری کوں کیا نسبت
ہمارے بہ جلے دل سے ہے پروانے کوں کیا نسبت
تن سیمیں بر اں پر جو قبا کا بر کھلا ہووے
لطافت سے بھی اوس کی گل کے کھل جانے کوں کیا نسبت
تمہارے شعلہ حسن و ملاحت سے جلا ہے دل
پتنگ کے شمع کی سوزش سے جل جانے کوں کیا نسبت

وہ گلرو کے تصوّر میں ہمارے اشک رنگیں ہیں
بہ چشم تر سے دریا کے ابل جانے کوں کیا نسبت

عجب رنگِ خزاں ہو باغ کا جب گل بدن جاوے
بھی اس گل رو کے جانے سے بہار آنے کوں کیا نسبت

پیا کے پان کھانے سے عجب دنتوں کا ہووے رنگ
بھی اوس سے لعل و یاقوت اور دُر دانے کوں کیا نسبت

جملۂ معترضہ

بیا ای سرو خوش رفتار و گلگشتِ خیاباں کن
زمی رخسار گلگوں سازِ مجلس راگلستاں کن

قطعات

نغمہ ابیض کا اب کہتا ہوں طرز اے دل ربا
رنگ پر خورشید کے اس کا رکھے ہیں یہ بنا
(بہت ہی) صبح دم جھو تیج رنگ مہر ہے صاف و سفید
ہے وہی تصویر اس کا خوب و زیبا دل کشا

(ہوگا) بسکہ سلطاں سارے محبوباں کا ہے گا جان جاں
جب محل میں آوے وہ بے تاب ہو سب گل رخاں
(تھالیوں) گوہر دل رکھ کے اپنا تھالیاں میں نین کے
اور جواہر سات اس کے وارتے ہیں ہر زماں

(ہوگا) چرخ کا ہیگا نمونہ صحن یہ دربار کا
بلکہ ہے کان جواہر اور دُرِ شہوار کا

واری جاتے شہ اُپر سے جگ کے سب خورشید رو
کسوت رنگیں کتیں سب پین اور زرتار کا (پہن)

فردیات

باغ میں کوئی تنگ دل غنچہ کے مانند جائے
نقش گلاں دیکھ وہ خندہ زناں بھار آئے (باہر)

(تمہارے) حسن کے آگے تمیں حسن پری زاد نیں (نہیں)
(تم سے) راست تمیں قد سنے یہاں کوئی شمشاد نیں (نہیں)

حسن سلطانی یہ شہ کے گلرخاں بلہار ہیں
باغ میں گر تم کوں دیکھیں گل گلے کا ہار ہیں

(تم پر) اگر مہ رو تصدق ہوں تمہارے پر مناسب ہے
کہ جس انوار پر شام و سحر قرباں کواکب ہے

فلک نے دیکھ یہ رخسار شہ کا
لے واری سیم و زر خورشید و مہ کا

(میں) جب آویں قصر احمر نیچ سلطاں
ہو ویں اون پر تصدق ماہ رو یاں (ان)

(سے نثار کرنے) سیجن پر سوں سٹتے فلک وار کر
زہرہ کوں گردوں کے شام و سحر

لے سیم و زر فلک نے خورشید و مہ کا باہم
کرتا نثار شہ پر لیل و نہار ہر دم

میر حیات میسوی

قدیم ریاست میسور میں علما، فضلا، شعرا اور مصنفین کافی تعداد میں
گذرے ہیں، ان میں سے بعضوں کی تخلیقات اشاعت پذیر ہوئیں اور بہتیرے اہلِ قلم
کی تحریریں مخطوطات کی شکل میں رہ گئیں، یہاں طباعت اور اشاعت کی اتنی سہولتیں
میسر نہیں تھیں، تاہم جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی فہرست کافی طویل ہوگی" جو کتابیں
ناشروں کے بقول " زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہیں"
ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو سوا سو برس سے بار بار اور کئی بار چھپی ہیں اور ہزاروں لاکھوں
کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں، احمد خاں شیرانی کی چار کرسی، منشی حسن علی آہ کی "نزد بان"
مولوی عبدالحی واعظ کا مجموعہ خطب حرمین الشریفین اور جنان البیر فی احوال سید البشر جسے
عرف عام میں سیر شریف کہتے ہیں اور مولوی میر حیات میسوی کی مصباح الحیات
اس ریاست کی مشہور و معروف اور مقبول عام اور متداول کتابیں ہیں جن کا لگ
بھگ ایک صدی سے بڑا چرچا ہے، مولوی عبدالحی واعظ بنگلور کے باشندے تھے
ان کی کتاب جنان البیر یا سیر شریف ہر سال بنگلور کے متعدد مطبعوں میں ہزاروں
کی تعداد میں چھپتی رہی، اب تک اس کی مجموعی تعداد اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ کی
پہنچ گئی ہے۔ مولوی میر حیات صاحب میسور کے باشندے تھے، ان کی شہرۂ آفاق
تصنیف مصباح الحیات کا بھی یہی حال رہا ہے۔ اس کی طباعت اور اشاعت فقط بنگلور
ہی میں نہیں بلکہ ملک کے دوسرے متعدد اور مختلف مقامات پر بھی ہوتی رہی ہے، بنگلور
اور میسور کے ان دو مصنفوں اور ان کی دو تصانیف نے اردو کے ذریعے دین و مذہب
کی جو خدمت انجام دی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ بنگلور اور میسور دونوں شہر ان پر

جس قدر ناز کریں بجا ہوگا، یہ دو بزرگ اور فاضل مصنف وماہتاب ہیں جن کی ان مایہ ناز تصانیف نے اردو کے ذریعے اس خطے میں دین حق کا نور پھیلایا ہے۔

مولوی میر حیات میسوری کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور ان کے مطبوعہ نسخے ہر جگہ ملتے ہیں ان کے مخطوطہ نسخے کراچی، علی گڑھ، بمبئی، مدراس، حیدرآباد ویلور اور میسور وغیرہ کی سرکاری، اداراتی اور شخصی مخطوطہ لائبریریوں میں موجود اور محفوظ ہیں، مخطوطات کی فہرستوں میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن بعض مقامات پر فہرست نگاروں نے ان کے بارے میں بڑی عجیب اور پرلطف باتیں رقم کی ہیں جو لیں ایجاد بندہ یا خانہ پری معلوم ہوتی ہیں، چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

میر حیات ...... کئی ایک چھوٹی چھوٹی مثنویاں اپنی اولاد کے لئے لکھی ہیں...... اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ان کا مدراس سے تعلق تھا"

(تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو۔ اول ص ۱۱۰)

"مصنف کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں"۔

(تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو - چہارم ص-۳۸)

"آب حیات" - اس کتاب میں گلستان سعدی کے طور پر حکایتوں اور قصوں کے پیرائے میں پند ونصائح لکھی گئی ہیں، اور اخلاق و تصوف کی تعلیم دی گئی ہے۔

(تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو چہارم۔ ص ۱۴۹)

حیات ایک اچھے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

(تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو چہارم۔ ص ۸۵)

سید حیات شاعر سے زیادہ ناصح اور مرشد ہیں۔

(تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو چہارم۔ ص ۱۴۶)

"آب حیات" یہ ایک دکھنی مثنوی کا پہلا باب ہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ پوری

مثنوی کتنے ابواب پر مشتمل تھی اور مصنف کون تھا، ممکن ہے کہ اس کا تخلص حیات ہو

(تذکرہ مخطوطات، ادارۂ ادبیات اردو۔ اول ص ۳۰۹)

"احوال النبی"۔ محمد حیات خاں حیات ۔ مولوی محمد حیات حیات تخلص میسور کے متوطن تھے۔ عربی، فارسی کی قابلیت رکھتے تھے، شاعر بھی تھے

(تذکرہ مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ اول ص ۱۹۸)

سید حیات ۔ تاج العقائد ۔ شرح عقائد نسفی۔ اردو ترجمہ

(قاموس الکتب، کراچی ۔ مخطوطہ نمبر ۔ ۱۵۵۴)

"سراج الحیات ۔ ہدایہ کا اردو ترجمہ"

(تذکرہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو۔ اول)

جامعہ میسور کے ایک لکچرر نے جواب خدمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں اپنے ایم، اے کے مقالے کے لئے میر حیات کا موضوع لیا تھا، لیکن وہ ناکام ہو گئے اور ان کا مقالہ پوشیدہ ہی رہ گیا۔ اس کے بعد ایک ریسرچ اسکالر نے دو ڈھائی سال اسی موضوع پر تحقیقی کام کیا، مگر ان کا مقالہ بھی منظر عام پر نہیں آیا، البتہ ڈاکٹر حبیب النساء بیگم پروفیسر اردو جامعہ میسور نے اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالے میں میر حیات اور ان کے کارناموں کا مختصر حال لکھا ہے جو ریاست میسور میں اردو کی "نشو ونما" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ تاہم شہر میسور کا یہ عظیم المرتبت مصنف بہت زیادہ توجہ اور قدر کا مستحق تھا، بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اس کے حالات زندگی اور اس کے تصنیفی کارناموں پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی

آپ کا نام میر محمد حیات تھا، مطبوعات میں بعض مقامات پر سید محمد حیات لکھا ہے، عام طور پر میر حیات کے نام سے مشہور ہیں، اپنی مثنویوں میں خود آپ نے سید حیات لکھا ہے، حیات آپ کا تخلص تھا

اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، جامعہ میسور کے ذخیرہ مخطوطات

میں کلیات حیات کا ایک نادر نسخہ موجود ہے جس میں آپ کے اکثر و بیشتر اردو اور فارسی رسائل نظم و نثر آگئے ہیں اور جو آپ کی وفات سے پانچ سال قبل یعنے ۱۲۷۶ھ میں کسی شخص اسد خاں نامی نے نقل کیا تھا، اس میں دو غیر مطبوعہ فارسی رسالے بھی موجود ہیں: "مجمع الارشاد اور سفینۃ النجات" دوسرے رسالے کے آغاز میں آپ نے اپنا نام میر حیات علی لکھا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے۔

"اما بعد می گوید فقیر الی اللہ میر حیات علی ابن میر یوسف عظیم آبادی"

رسالے کا اختتام اس بیت پر ہوا۔

این قدر بس کفایت است حیات ؎ باد بر مصطفیٰ درود و صلوٰت

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے والد کا نام میر یوسف تھا جو عظیم آباد کے متوطن تھے، عظیم آباد سے یہاں مراد پٹنہ تو نہیں ہو سکتا، شاید ریاست میسور ہی کے کسی مقام کا نام ہوگا، ٹیپو سلطان شہید نے سلطنت خداداد کے متعدد مقامات کے نام بدل کر اپنی طرف سے نئے نام رکھے تھے، مثلاً نظر آباد، ظفر آباد منظر آباد، گلشن آباد وغیرہ۔ لیکن کسی تاریخ میں کہیں عظیم آباد نام نہیں ملتا۔ ایک روایت ہے کہ میر حیات اور ان کے والد کولار کے متوطن تھے، ممکن ہے سلطان نے کولار ہی کا نام عظیم آباد رکھا ہو۔ بہر طور میر حیات ریاست میسور ہی کے کسی شہر کے متوطن تھے، تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔ آپ نے صرف اپنی پہلی مثنوی "مفتاح الایمان" کا سال تصنیف ۱۲۴۴ھ بتایا ہے اور سال وفات ۱۲۸۱ھ ہے۔ سنا ہے کہ آپ نے کافی طویل عمر پائی، اگر ستر سال کی عمر بھی قرار دے لی جائے تو سال ولادت ۱۲۱۱ھ برآمد ہوتا ہے، بہر طور آپ ٹیپو سلطان کی شہادت اور زوال خداداد کے چند سال قبل یا بعد پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر یا دیس ہی میں ہوئی ہوگی، اس کے بعد آپ ویلور چلے گئے اور وہاں جنوبی ہند کے مشہور و معروف مدرسۂ لطیفیہ، حضرت مکان پر دس بارہ سال تک

عقلی اور نقلی علوم کی تحصیل کی جن میں طبِ یونانی بھی شامل تھی، اس زمانے میں مدرسۂ لطیفیہ میں جو درس رائج تھا وہ درس نظامی تو نہیں تھا بلکہ اس سے کچھ ملتا جلتا تھا اور کچھ مختلف بھی، اس میں تفسیر و حدیث اور فقہ و فرائض کے ساتھ تصوف کی تعلیم و تربیت بھی شامل تھی اور منطق و فلسفہ اور ہیئت کے ساتھ ہی طبِ یونانی بھی پڑھائی جاتی تھی، یہ بزرگانِ ویلور کا وضع کیا ہوا درس تھا جو اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو بیک وقت عالم، فاضل، صوفی اور طبیب بنا دیتا تھا۔ ویلور کا یہ عظیم الشان مدرسہ اقطاب ویلور کی زیرنگرانی جنوبی ہند میں علوم دینیہ کا نور پھیلاتا رہا، اس علاقے میں جتنے اکابر علماء گزرے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر یہیں کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ میر حیات کی طالب علمی کے زمانے میں سید شاہ ابوالحسن قادری محوی مسندِ سجادگی پر رونق افروز تھے، آپ کے علم و فضل کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے آپ صاحبِ ارادت و سلوک تھے اور بڑے جید عالم، درس بھی دیتے تھے، اکثر آپ پر جذب طاری رہتا تھا۔ میر حیات نے آپ سے درس بھی لیا اور بیعت بھی ہوئے۔ دوسرے جید علماء سے بھی کماحقہ استفادہ کیا جو ان دنوں اس مدرسے میں درس و تدریس پر مامور تھے، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بحرالعلوم عبدالعلی مدراسی اور ملک العلماء باقر آگاہ ویلوری سے بھی فیض حاصل کیا، سب سے بڑی خوبی یہ ہوئی کہ آپ کو حضرت محوی کے صاحبزادے قطب ویلور حضرت محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی کی ہم جماعتی اور رفاقت و صحبت نصیب ہوئی جو اس زمانے میں طالبِ علمی کی منزلیں طے کر رہے تھے اور جنہوں نے سجادہ نشینی کے بعد اپنے درس و تدریس، افتاء و تصانیف، دعوت و تبلیغ، تصوف و سلوک اور تبحر علمی کے ذریعے جنوبی ہندوستان میں ہل چل مچا دی، میر حیات نے اپنی پہلی مثنوی مفتاح الایمان میں ان کی اور ان کے خانوادے کی مدح یوں کی ہے۔

خانوادہ حضرت محی الدین افضل از ہمہ خانوادہ ہاے متین

ہے افضل خانوادوں سے زیادہ ؛ محی الدین کا ہے خانوادہ
نور رکھ اس سے ارادہ پاک اے یار ؛ ہے تیرے دل منے گر شوق دیدار
عبث اپنے کئے نیں ہرگز نکو کھو ؛ مرید اب قادری میں جا کے تو ہو

حصولِ علم سے فراغت کے بعد میر حیات میسور آئے اور یہیں کے ہو رہے یہاں معلمی اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا، آپ کا پہلا نکاح فارسی کے مشہور ادیب مصنف شاعر اور استاد منجم غلام حسین کی دختر سے ہوا، منشی غلام حسین خدمت سے سبکدوش ہوئے تو میر حیات ان کی جگہ مہاراجہ میسور کے دفتر پر فارسی کے منشی مقرر ہوئے اور ایک مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تو ایک اور صوفی بزرگ سید حسین علی شاہ قادری کی دختر سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا، یہ بزرگ حیدرآباد سے میسور آکر مقیم ہو گئے تھے، فارغ البال، کشادہ دست اور بڑے وضع دار بزرگ تھے۔ انہوں نے میر حیات کو سری رام پیٹ کی مسجد کے دروازے کے سامنے ایک گھر دے رکھا تھا، میر حیات اسی گھر میں بچوں کو پڑھاتے اور طبابت کرتے رہے ۱۲۸۱ھ میں اسی گھر میں آپ کی وفات ہوئی، بڑے مکان کے گنبد کے جنوبی صحن میں آپ کی قبر موجود ہے، ان کے سوا میر حیات کے اور حالات زندگی معلوم نہیں۔ میسور کے ایک اور صاحب تصنیف ادیب اور شاعر صوفی احمد علی آحمد ایک ہی تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے رسالہ سرمہ بصیرت میں بزرگان شہر میسور کے حالات قلمبند کئے ہیں یہ رسالہ خود آپ کے دست خاص سے لکھا ہوا مسجد بندگی شاہ میسور کے کتب خانے میں موجود تھا اس کی ایک نقل میں نے بھی لے رکھی ہے، اس میں احمد علی آحمد نے میر حیات کا مختصر تذکرہ یوں لکھا ہے

"مولوی میر حیات"

علوم عقلی و نقلی اور تصوف میں دخلِ تمام رکھتے تھے، کسب و ریاضت سے

درجہ شہود پایا تھا، اکثر لوگوں کو تالیف و تدریس سے فیض پہنچا، ان کا مجموعہ تالیفات بمبئی میں چھپ کر کئی بار شائع ہوا ہے، اس ملک میں کوئی قریہ نہیں جس میں یہ کتاب موجود نہیں۔ اس میں ایک رسالہ منظومہ مسمی بہ آبِ حیات تصوف میں محققانہ لکھا ہے، بعد حضرت منشی صاحب (منشی نجم غلام حسین) کے منشی حضور مہاراجہ صاحب بہادر رہے تھے۔ علمِ طب میں مہارت کاملہ تھی، بڑے ذہین و فہیم تھے، تشخیص مرض میں ان کا ثانی نہ تھا ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی۔

اشعار

ربع را راحت بشمر در فیض بخشی چوں نگیں ؛؛ در سیاہی سر زند روشن کند نام دگر
اثر صحبت بد نیک تسلسل دارد ؛؛ سگ دیوانہ گزیدہ سگ دیوانہ بود
لیکہ زیبندہ کنارے برخ زیبا شد ؛؛ بر سر سورۂ نور ست طلائی جدول

صوفی احمد علی کی تصوف، دینیات، قواعد فارسی وغیرہ پر سات آٹھ اردو تصانیف اور ایک نعتیہ دیوان مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے اور آپ کا انتقال ۱۳۲۹ھ میں ہوا۔

مصباح الجنان کے آخر میں میر حیات کی وفات کا ایک قطعہ تاریخ اور ایک مصرعہ تاریخ شامل ہے اور دونوں فارسی میں ہیں، قطعہ تاریخ غلام محمد علی عبد الرؤف المعروف بہ امیراں اکبر پوری (بیٹے میسوری) کا کہا ہوا ہے، اس کے سرنامہ میں بھی مصنف کا نام میر حیات علی لکھا ہوا ہے۔ تاریخ وفات والی بیت یہ ہے

از سر آب حیات نے بہ امیراں خضرم
آہ صد آہ حیات دو جہاں رفتہ بگفت

۱۲۸۱ھ

مصرعِ تاریخ ابو الخیر محمد عبد الحق نرجنا پلوی کا کہا ہوا یہ ہے۔

جانِ مولانا حیات رفت
۱۲۸۱ھ

میر حیات کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

مصباح الحیات:۔ یہ مجموعہ بائیس رسائل پر مشتمل ہے اور تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے

عشرہ مبشرہ :۔ حضرات خمسہ اور کشفِ کبریٰ۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

عشرہ مبشرہ: ۔ اس حصے میں یہ دس رسائل ہیں۔

۱۔ سراج العقائد۔ مثنوی۔ عقائد و احکام دین کا مختصر بیان

۲۔ سراج الفقہ۔ مثنوی۔ پنج بناء اسلام کی تشریح

۳۔ مرأۃ الاحکام۔ مثنوی۔ نکاح، طلاق، رضاع، ظہار، لعان، عدت، حدود، شرکت و مضاربت، جہاد، ارتداد، قذف، کفارہ، لقیط، قصاص ربوا، دعویٰ، قضا، اجارہ اور کفریات کے مسائل کا بیان مختصر طور پر

۴۔ تاج الفرائض مثنوی :۔ فرائض یعنے تقسیم میراث کا نہایت جامع اور مختصر بیان

۵۔ تاج النصائح۔ مثنوی۔ علم، محبت، فکر و ذکر، رضا، شکر، وفا، احسان، سخاوت، تواضع، صبر، توکل وغیرہ کا موثر اور دل کش بیان

۶۔ آداب السعادہ :۔ مثنوی۔ عام آداب و اخلاق کی تعریف

۷۔ احوال النبیؐ :۔ مثنوی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مختصر حالات طیبہ

۸۔ نور الہدیٰ :۔ مثنوی۔ ایمان اور معرفت کا بیان

۹۔ شفاعت نامہ:۔ مثنوی۔ روز قیامت حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شفاعت کا بیان

۱۰ :۔ دیدار نامہ :۔ مثنوی۔ رویت حق تعالیٰ کا بیان

حضرات خمسہ :۔ یہ حصہ پانچ رسائل پر مشتمل بنایا گیا ہے لیکن اس میں چھے رسالے آگئے ہیں جن کا مختصر تعارف حسبِ ذیل ہے

۱۔ تاج العقیدہ :۔ مثنوی۔ یہ مختصر ترین مثنوی ہے اور اس میں بچوں کے لئے اسلامی بنیادی عقائد کا بیان ہے۔

۲۔ شرف الایمان :۔ نثر۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم، اہلِ بیت اطہار اور

خلفائے راشدین کے فضائل

۳ - نجات نامہ :- نثر - نماز روزے کے اہم مسائل

۴ - نورالاسلام :- نثر - چند اہم احادیث شریفہ کی تشریح جن کا سیکھنا اور یاد رکھنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

۵ - ہدایت نامہ :- نثر - ایک عیسائی اور ایک محمدی کا باہمی مناظرہ - سوال و جواب کے پیرایہ میں، یہ بہت دلچسپ رسالہ ہے

۶ - مفتاح الایمان :- مثنوی - اسلامی عقائد کی تفصیل اور تشریح، خود مصنف کے بقول یہ آپ کی اردو میں پہلی تصنیف ہے۔

صرف اس کتاب میں سال تصنیف بھی مذکور ہے جو ۱۲۴۴ھ ہے

کشف کہربی :- اس حصے میں درج ذیل چھے رسالے ہیں جن میں سے آب حیات نہایت اہم ہے اور ضخیم بھی، یہی میر حیات کی طویل ترین مثنوی ہے

۱ - آب حیات :- مثنوی - اس کا موضوع تصوف اور سلوک و طریقت ہے - پانچ ابواب پر مشتمل ہے - طریقت، معرفت اور حقیقت کا بیان قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا گیا ہے - حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اصحابہ کرام، بزرگانِ دین وغیرہ کی نہایت برمحل اور برجستہ روایتوں اور حکایتوں کا بیان کیا ہے اور ان سے اپنے بیانات کا استدلال کیا ہے اشاہ میر کڑپوی، شاہ کمال کڑپوی اور بندہ نواز گیسو دراز کی چند حکایتیں بھی لکھی ہیں کئی تمثیلیں بھی جا بجا لائی ہیں، یہ اسلامی تصوف پر نہایت مختصر لیکن جامع کتاب ہے امیر حیات کا تصوف نظریاتی نہیں بلکہ دینی اور عملی ہے اور اس کی بنا قرآن و حدیث پر قائم ہے

۲ - کلید معرفت :- نثر - حروف تہجی کی ترتیب سے اصطلاحات تصوف کی مختصر لغات ہے

۳ ۔ باب المغفرت :۔ نثر۔ ذات باری کے متعلق تین بنیادی عقیدوں کی تشریح
۴ ۔ دستور الایمان :۔ نثر۔ نماز وغیرہ کے چند مزید مسائل
۵ ۔ زاد الایمان :۔ نثر۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے چند مزید فضائل۔
۶ ۔ نور الایمان :۔ نثر۔ شرک و کفر کا بیان

سراج الحیات :۔ یہ ایک اور مجموعہ ہے جو چوبیس چھوٹے بڑے رسائل نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک دلچسپ رسالہ فارسی میں ہے، لیکن یہ مجموعہ اس قدر مشہور اور مقبول نہیں ہوا جتنا مصباح الحیات، اس کے رسائل کا مختصر تعارف درج ذیل ہے

۱ ۔ عقائدِ حیات :۔ مثنوی۔ اسلامی عقائد کا بیان جامع اور مختصر۔
۲ ۔ انوارِ سرمدی :۔ نثر۔ "عقائد حیات" کے ابیات کی تشریح اور توضیح نثر میں
۳ ۔ باب الطہارت :۔ مثنوی۔ طہارت، وضو اور غسل کے مسائل۔
۴ ۔ وصفِ نماز :۔ مثنوی۔ طریقہ نماز کا بیان۔
۵ ۔ باب الصلوٰۃ :۔ مثنوی۔ نماز کے مسائل و احکام
۶ ۔ زاد السفر :۔ مثنوی سفر اور مسافر کے مسائل و احکام
۷ ۔ باب الوفات :۔ مثنوی۔ موت اور میت کے احکام و مسائل
۸ ۔ باب الصوم :۔ مثنوی۔ روزے کے احکام و مسائل
۹ ۔ باب الزکوٰۃ :۔ مثنوی۔ زکوٰۃ کے احکام و مسائل
۱۰ ۔ باب الحج :۔ مثنوی۔ حج کے احکام و مسائل
۱۱ ۔ زاد الآخرت :۔ مثنوی۔ پانچ کلموں کی تشریح
۱۲ ۔ سنت الاسلام :۔ نثر۔ ایمانیاتِ اسلام سوال و جواب کے پیرائے میں۔
۱۳ ۔ تعلیم النساء :۔ مثنوی۔ حقوق زوجین کا بیان۔ اس میں جابجا اہلِ بیت کرام اور صحابہ کرامؓ کی حکایتیں نقل کی گئی ہیں۔

۱۴ - حق الوالدین : - مثنوی - حقوق والدین کی تفصیل اور تشریح جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور صحابہ کرامؓ کی حکایتوں اور دیگر تمثیلوں سے استدلال کیا گیا ہے

۱۵ - جنات النعیم : - مثنوی - خدائے تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کا بیان جو تخلیقِ انسانی کا مقصد ہے۔

۱۶ - دارالسلام : - مثنوی - شرک و کفر سے پرہیز اور احتیاط کی تعلیم

۱۷ - حرمت النکاح : - مثنوی - حرام رشتوں کی تشریح جن سے نکاح نہیں ہوسکتا

۱۸ - حسنِ خط : - خوش نویسی کے اصول و قواعد جس میں روشنائی، قلم، کاغذ اور خط نستعلیق وغیرہ کے لوازم بیان کئے گئے ہیں

۱۹ - مجموعہ سبع صفات : - توشہ عاقبت - نثر - ولادت سے لے کر وفات تک کام آنے والے بنیادی احکام دین -

۲۰ - مکارم اخلاق : - نثر - فلسفہ اخلاق کی تشریح اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم

۲۱ - ترجمہ قصیدہ بردہ شریف : - منظوم - بوصیری کے مشہور قصیدۂ بردہ کا اردو نظم میں کامیاب ترجمہ

۲۲ - صراط الحق : - نثر - شریعتِ اسلامیہ کے چند عام مسائل سوال جواب کے پیرائے میں

۲۳ - مختصر - نثر (فارسی) اردو میں پیر حیات کی لکھی ہوئی ایک نعتِ شریف اور فارسی نثر میں اس کا ترجمہ اور توضیح

۲۴ - تہذیب النساء : - مثنوی - مسائلِ حیض و نفاس

خمسہ حیات : - نثر - اس کا موضوع تصوّف ہے اس میں سوال و جواب کے پیرائے میں تصوف کے ان پانچ اہم مسائل کی شرح و تفسیر بیان کی گئی ہے توحید، جبر و قدر، تجدد، بیعت اور وصال، کتاب کے آغاز میں لکھا ہے بیں رکھا حضرات خمسہ اس کا نام ؔ بولئے خمسہ حیات اس کو تمام

آپ نے اس کا نام حضرات خمسہ رکھا تھا، لیکن خمسہ حیات کے نام سے شائع ہوئی
مصباح الحیات میں جو حصہ حضرات خمسہ کے نام سے موسوم ہوا ہے اس سے اس کا
کوئی تعلق نہیں ہے

شمع محفل :- یہ میر حیات کی فارسی تالیف ہے، ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ
فارسی نثر میں لکھا ہے۔ پھر مختلف اور متعدد عنوانات اور موضوعات کے تحت
اساتذہ کے اشعار جمع کئے ہیں، ہر شعر کے ساتھ شاعر کا نام بھی بتایا ہے اور ساتھ
ہی ساتھ اپنے فارسی شعر بھی رقم کئے ہیں، مقصد یہ بتایا ہے کہ ان کے استعمال سے
تحریر میں متانت اور تقریر میں بلاغت پیدا ہو، آخر میں دو باب فارسی اور عربی
کی ضرب الامثال کے بھی قائم کئے ہیں جو عام طور پر تقریر اور تحریر میں استعمال ہوتے ہیں
اس تالیف سے میر حیات کے مطالعے کی وسعت، ذوق شعر اور حسن انتخاب کا حال
معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ آپ کا فارسی کلام بھی ملتا ہے جو اور کہیں نہیں ملتا
کوئی مستقل نظم تو نہیں ملتی، ابیات کی حیثیت افراد کی ہے۔

درج بالا فہرست سے ظاہر ہے کہ میر حیات کے مطبوعہ رسائل کی تعداد
جملہ اڑتالیس ہے جن میں سے تیس اردو مثنویاں ہیں، ایک قصیدہ بردہ کا منظوم
ترجمہ ہے، پندرہ اردو نثر میں ہیں اور دو فارسی ہیں، اردو ابیات کی تعداد ساڑھے
چھے ہزار سے زیادہ کی ہوتی ہے، فارسی ابیات جملہ اکسٹھ ہیں "شمع محفل" شاید
ایک ہی مرتبہ مطبع مسلمانی ویلور سے ۱۲۷۸ھ میں چھپ کر شائع ہوئی. سراج الحیات
پہلی بار ۱۲۷۱ھ میں بمبئی سے شائع ہوئی، اس کے بعد دو تین اور اشاعتیں اس کی
بمبئی ہی کے کسی مطبع سے ہوئیں، خمسہ حیات بھی ۱۲۷۸ھ میں مطبع مسلمانی ویلور اور
مطبع حیدری بمبئی میں بیک وقت طبع ہوا۔ "مصباح الحیات" جن رسائل پر مشتمل ہے
وہ سب سے پہلے مطبع جامع الاخبار مدراس سے جدا جدا چھپ کر نکلے، پھر بنگلور کے
پریسوں میں ان کی طباعت ہوئی، چند سال بعد ان کا مجموعہ "مصباح الحیات"

کے نام سے شائع ہونے لگا، لیکن سب رسالے میر حیات کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے، بعض رسالے تو متعدد مرتبہ چھپے، رسائل مصباح الحیات کے مخطوطے تو ملک کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، لیکن باقی رسائل کے مخطوطے بہت کم یاب ہیں اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹوٹ، جامعہ میسور، میں "کلیات حیات" کا ایک نادر نسخہ نہایت نفیس نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے، اس کی کتابت اسد خاں نے ۱۲۷۶ھ میں یعنے میر حیات کی وفات سے پانچ سال قبل کی تھی، اس میں میر حیات کی قریب قریب سب مطبوعہ تصانیف شامل ہیں اور ان کے علاوہ فارسی کے دو مزید غیر مطبوعہ رسالے بھی موجود ہیں، اوسط ضخامت کے رسالے ہیں، ایک کا نام مجمع الارشاد ہے اور دوسرے کا سفینۃ النجات، پہلے رسالے کا موضوع تصوف و اخلاق ہے۔ اور دوسرے میں توحید باری تعالیٰ اور اسلامی معتقدات کا بیان ہے۔ یہ کتاب کچھ بسیط ہے اور لمعات میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر لمعے کی مزید تقسیم تجلیات کے عنوان سے کی گئی ہے۔ ان دونوں کا شمار کر لیا جائے تو میر حیات کے رسائل جملہ پچاس تک جا پہنچتے ہیں

مفتاح الایمان میر حیات کی پہلی اردو تصنیف ہے، اس کے آخر میں آپ نے سال تصنیف یوں رقم کیا ہے۔

بحمداللہ کہ یہ مفتاح الایماں	ہوئی آخر بحق شاہ عرفاں
سن ہجری تھا سو فرمائے بار	ہزار و دو صد و چالیس پر چار

آپ نے خود اس کے خاتمے میں لکھا ہے ؎

سنو اے بھائی جاں کرم وعطا سے	بنی آدم مرکب ہے خطا سے
کہ میں نادان تر ہوں اور گنہ گار	لیا ہوں میں گنہ کے سر اپر بار
نہ مجھ کو لفظ و معنی کی خبر ہے	ردیف و قافیہ پر نا نظر ہے
کبھی یک بیت دکھنی میں لکھیا نیں	ضرورت اس کے تئیں دکنی کیا میں
عوام الناس کی میں گفتگو پر	لکھیا ہوں صاف اس کو اے برادر

تکلف میں کیا ہوں دیکھ منظوم — کہ تا ہر یک کو ہووے صاف معلوم

الٰہی کر مری خاطر کے تئیں شاد — دو عالم سے مرادل کر تو آزاد

ظاہر ہے کہ اس سے پہلے آپ نے اس زبان میں کچھ نہیں لکھا، شاید فارسی میں کچھ لکھا ہوگا۔ یہ مثنوی آپ نے ٹیپو سلطان کی شہادت کے تئیس سال بعد اور آج سے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال قبل ریاستِ میسور میں عوام کی گفتگو کی صاف زبان میں کسی تکلف کے بغیر لکھی، گویا اس میں اور اس کے بعد آپ نے جو رسالے لکھے ان میں اس زمانے کی عام بول چال کی اردو محفوظ ہے، اس زبان کو آپ دکنی کہتے ہیں اور مختصر نامی فارسی رسالے میں اسے ہندی کے نام سے پکارتے ہیں اُردو کا نام آپ نے کہیں نہیں لیا، مفتاح الایمان اور دوسرے رسالوں کے مطبوعہ نسخوں کی زبان مخطوطات سے کچھ مختلف ہے، الفاظ کچھ بدل گئے ہیں اور دکنی رنگ کم ہو چلا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناشروں نے کچھ "اصلاح" کرادی ہے۔ چنانچہ مصباح الجنات مطبوعہ مطبع محمدی بنگلور سنہ ۱۳۰۹ھ کے خاتمے پر مرقوم ہے۔

"مخفی نہ رہے کہ اس کتاب میں صدہا غلطیاں آگئی تھیں، بعونہ تعالےٰ اس بار کے طبع میں ایک مولوی صاحب جامع علوم ظاہر و باطن کی صحبت سے بہت صحت کی گئی"۔

یہ صدہا غلطیاں مضامین اور مطالب میں تو نہیں ہو سکتیں، ان سے مراد دکنی الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں جن کو بدل دیا گیا اور اس عمل کو صحت کے نام سے موسوم کیا گیا، چنانچہ اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کلمات اور مطبوعہ مصباح الجنات میں مشمولہ مفتاح الایمان ہی کا مقابلہ کیا جائے تو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے مثلاً بعض مقامات پر الفاظ کی تبدیلی یوں ہوئی ہے۔

مخطوطہ	مطبوعہ	مخطوطہ	مطبوعہ
تے	سے	او	وہ

کبھو	کبھی	نکو	نہ
ہور	اور	سوں	سے
کاماں	کاموں	اچھے	رہا ہے
انہوں کے	انہیں کے	نوا	نیا

میر حیات بڑے اچھے خوش نویس تھے، خود ان کے دستِ خاص سے لکھا ہوا تعلیم النساء کا ایک مخطوطہ مسجد بندگی شاہ کے کتب خانے میں موجود ہے، اس کی زبان اور مطبوعہ نسخے کی زبان میں بھی یہی فرق ہے۔ تاہم ان رسائل کی دکھنیت کو پوری طرح سے بدلنا ناممکن ہے

میر حیات کی تصانیف زبان اور مضامین دونوں کے لحاظ سے بڑی اہمیت اور قدر و قیمت کی مالک ہیں۔ آپ نے انیسویں صدی کے ربع اول میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا جب سلطنت خداداد کا چراغ بجھ چکا تھا، اس کے بعد پہلے مہاراجہ کی حکومت قائم ہوئی پھر ۱۸۳۱ء میں انگریزوں نے مہاراجہ کو تخت سے ہٹا کر ریاست میں اپنا راست اقتدار قائم کر لیا تھا، اردو بولنے والے گرنے کے بعد پھر اٹھ رہے تھے، انگریزی حکومت پچاس سال یعنی ۱۸۸۱ء تک قائم رہی اس دور میں اس ریاست میں اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بنگلور اور میسور میں شعر و سخن کا بڑا چرچا ہوا، بنگلور اردو صحافت کا ایک اہم مرکز بن گیا، علما فضلا تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے، متعدد پریس طباعت کا کام کرنے لگے۔ کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں اس وقت تک اسلامی دینیات عموماً فارسی میں تھے اور عوام کی زبان اردو میں چند مختصر اور بالکل ناکافی رسالوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی، میر حیات نے مسلمانوں کو احکام دین سے واقف کرانے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جو اس افراتفری کے دور میں سیاسی زوال کے بعد ان کے مصائب و آلام کا واحد علاج تھا، چنانچہ آپ نے عوام کی سیدھی سادی، بے تکلف اور بول چال کی زبان میں اسلامیات کا ایک مختصر لیکن

جامع انسائیکلوپیڈیا تیار کر دیا، اس کے لئے آپ نے عالمانہ انداز کی زبان استعمال نہیں کی، اسی وجہ سے ان کو اتنا قبول عام نصیب ہوا۔ ایک مسلمان کے لئے میر حیات کے رسائل زندگی بھر کے لئے کافی ہیں، دینیات کا شاید ہی کوئی شعبہ ہوگا۔ جو آپ نے نظر انداز کر دیا ہو، ان رسائل کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں ریاستِ میسور کے عوام کی عام بول چال کی دکنی کا خزانہ محفوظ ہو گیا ہے، یہی زبان آج بھی اس خطے میں بولی جاتی ہے۔ میر حیات کی زبان نہ قدیم دکنی ہے نہ جدید اردو بلکہ عبوری دور کی دکھنی ہے۔ جب اردو نے دکھنی پر اپنا رنگ جمانا شروع کیا تھا، چند ابیات نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ؎

نہ مجبور بندہ نہ مختار ہے میانہ پنا بیچاں سزاوار ہے بین

آرزو دنیا کی ہرگز کر نکو اس طمع کے بیچ ہرگز مر نکو نہ

کئی ۔ راختاں ہیں کے طرح کے راختاں نعمتاں ہیں کے طرح کے نعمتاں

کسی ۔ نہ کس کو جنا اور نہ کوئی اسکے تئیں بھی اس ذات کو مثل و مانند نیں نہیں

جدائی نکو مرد عورت میں لا بھی ان دو میں ہرگز برائی نہ کجا ڈال

شنو چار فرضاں وضو بیچ ہیں یہ اول ہوا فرض دھو منہ کے تئیں

آپ آجبروت میں وہ گل بدن ہے چلایا نائباں کو چو کدن چاروں طرف

لوگ ۔ وائے ویلا آہ کرتے سب جنے آئیں گے روتے ہوئے موسیٰ کنے کے پاس

تم ۔ سخن میرا تمہیں تحقیق مانو اتھا یہ مرد سو جبریل جانو تھا

ہو رہے ۔ اچھے اک ملک پر دو شاہ کا راج جہاں اک آن میں ہو جائے تاراج

اپنجا ۔ ایس قدرت سے خن دو جگ نبایا یکا یک نیست کو ہستی میں لایا

اور ۔ نہ کم ہووے کبھو ہور نا زیادہ ہے اس کو اختیاری ہور ارادہ اختیار، اور

صفاتاں اس کے ذاتی ساتھ ہیں مان حیات اول صفت ہے سب میں جان ہیں

جیبھ ۔ نہ حرکت بال کو ہونا چلیے خار بغیر از حکم اس کے نا ہلے پات نہ

ہو ۔ اچھے سنگ سیہ اور رین تاریک چلے گر اس پہ چمٹی کوئی باریک چیونٹی

ده سدا انسان کو قدرت دیا آو — زبردستی نہیں کس پر کیا او کسی

ہیں جو کچھ عالم منے راحت کے ہیں کام — خوشی ہور خرمی ہور عیش و آرام اور

سنو سکرات ہیں ایمان لانا — نہیں مقبول کر بولے ہیں دانا کرکے کچھ کر

نظر کرتا ہوں ہیں سب کے دلاں پر — رکھے ہیں نیتاں کیا کیا چھپا کر

خدا کی بندگی ان کی غذا ہے — اونہوں کو یاد حق کا سو مزا ہے ان کو

ہیں جو کچھ دنیا منے ہے چیز اور شے — ملک اس سار کا سن اس منے ہے طرح

نئے کتاباں ہیں قدیم ہرگز نوے نین — کتاباں اس کے سب مخلوق نین ہیں

ہیں نبیاں سب ایک ہیں آپس منے جان — نکو کر فرق ان میں دیکھ قرآن

حق کہا قرآن ہیں اے دوستاں — ظالموں پر لعنتاں ہیں لعنتاں

کی ایک۔ ہے ہدایت اس کی کے اک طور پو (پر) — میں بیاں کرتا ہوں اس کے طور دو

ہیں شیخ شرف الدین تھے مکہ منے — ایک دانا جا کے پوچھا ان کنے پاس۔ت

ایک دن شوہر کہا عورت کنیں — جہاں کھڑے رہ جھرکو آتا ہوں میں کرکے

محبت کس قدر تجھ پر کئے مہر و سیا — دل میں رکھ اس بات کی شرم و حیا

باپ ماں کو جن ستاوے لے اخی — دوزخی ہے دوزخی ہے دوزخی

بھائی جاں دوزخ میں جانا خوب نیں — باپ اور ماں کو ستانا خوب نیں

کروں ابتدا میں بحمد خدا — عدم تھے ہمیں ہم کو پیدا کیا ہم

مجھ سے آہ میرے سے اگر کچھ ہو خلاف — تو خدا کے واسطے کرنا معاف

صبح کو ماں کے قدم کو چوم کر — بولتے رو رو کو یوں حضرت عمر کر یوں

وہ ماں کنیں پانی انو لا کر دئے — ہور دعا ماں کی انو دل سے لئے

جو جس نے بھیجا۔ راز مخفی کو جن بھیجا نیا ہے — جان ہور دل سے اس کو مانیا ہے مانا

فاطمہؓ کو جب علیؓ شادی کئے — فاطمہ کو یوں نبیؐ فرما دئے

جب کہ حضرت مصطفےٰ خیر البشر — کر کو شادی عائشہؓ کو لائے گھر کرکے

زاہد ہ اک آکو پوچھی ان گنے
تھے ۔ رابعہ بصری انھے حجرے منے
نہ اس کو شریک و مددگار ہے
کرنے والا ۔ دو عالم کا پیدا کرنہار ہے

نے ، تمام مثنویوں میں صرف ایک جگہ نظر سے گزری ، دکھنی الفاظ کثرت سے آئے ہیں ، جمع دکھنی کے قاعدے سے بنائی گئی ہے ، تذکیر و تانیث کے قاعدے بھی اکثر دکھنی کے عمل در آمد ہوئے ہیں ۔ مختصر یہ کہ میر حیات کی نظم و نثر دونوں میں دکھنی رنگ غالب اور نمایاں ہے ۔ زبان و بیان پر میر حیات کو بڑی قدرت حاصل ہے ، کلام میں بڑی روانی ہے اور ثقالت اور تنافر کا کہیں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا ، زبان بہت شیریں اور دل کش ہے ، بیان میں سلاست کوٹ کوٹ کر بھری ہے ، ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے ، اندازِ " دل خیزد و بر دل ریزد " کے بمصداق مثنویاں تاثیر سے بھری ہوئی ہیں ، ایک ایک بات دل میں اتر جاتی ہے اور نقش کالحجر بن جاتی ہے ، واعظانہ اور مصلحانہ انداز ہے اور اس کی بنا خلوص ، للّہیت اور بے لوثی پر قائم ہے ، میر حیات بڑے جید عالم و فاضل تھے ، دینیات میں بڑی گہری نظر تھی ، کئی ابیات قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث شریف کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ، قال اللہ اور قال الرسولؐ کی ترجمانی بڑی دیانت اور صداقت کے ساتھ کی ہے اور کہیں سر مو تجاوز ہونے نہیں پاتا ۔

مثنویوں میں اور نثری رسالوں میں بھی عنوانات فارسی میں لکھے ہیں ہر رسالے کا آغاز نہایت رقت آمیز انداز میں حمد و نعت اور مناجات سے کرتے ہیں مثلاً تاج النصائح کا آغاز ان ابیات سے کیا ہے ؎

ربنا یا ربنا یا ربنا ؛ کس زباں سے ہو سکے تیری ثنا
یا رحیمی یا رحیمی یا رحیم ؛ یا کریمی یا کریمی یا کریم
راہ ایسی کر ہمارے تئیں عطا ؛ جسمیں راضی تو رہے اور مصطفےٰ
مصطفےٰ پر جان و دل قربان ہے ؛ جب تلک اس تن کے اندر جان ہے
ہو محمدؐ پر درود اں اور سلام ؛ آل اور اصحاب پر ان کے مدام

اور ہر رسالے کے خاتمے پر بھی مناجات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، آخر میں اپنا تخلص بھی لاتے ہیں، مثلاً مرات الاحکام کا خاتمہ ان ابیات پر کیا ہے

اس فقہ کو ہے لکھا سید حیات　　تو دعا کر خوش ہیں اس کے دل کے سات

اے خدا ایمان پر کر خاتمہ　　اب بحق مصطفےٰ اور فاطمہ

مرآۃ الاحکام ہو گئی اب تمام　　مصطفےٰ پر ہو درود اور سلام

میر حیات نے تعلیم اور تبلیغ کے لئے نظم کا استعمال کیا ہے، فقط مثنویاں کہی ہیں اور ان کی مثنویوں میں زبان کی شیرینی اور بیان کی سلاست اور روانی کی خوبیاں ضرور موجود ہیں، فقط تک بندی نہیں کی، بلکہ بندش کی چستی، قافیہ و ردلیف کی پابندی اور زبان و بیان کی سادگی کا پورا خیال رکھا ہے، لیکن ان سب کے باوجود آپ کو شاعر کہنا اس قدر موزوں اور مناسب نہ ہوگا۔ شاعری آپ کا مقصود کبھی نہیں۔ آپ بس ایک معلم اور مرشد ہیں، فارسی اشعار میں بھی آپ کا یہی رنگ ہے، آپ کے رسائل کی معنوی حیثیت بے شک بہت بلند پایہ اور قابلِ قدر ہے، مطالب و مضامین نہایت پرلطف، دلآویز اور کارآمد ہیں مثلاً ایک جگہ شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی تعریف حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زبانِ مبارک سے یوں بیان کی ہے، حضورؐ حضرت بتولؓ کے سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔

ہے شریعت جو کہا ہوں میں پیام　　ہے طریقت جو کیا ہوں میں سو کام

میں جو دیکھا ہوں حقیقت اس کا نام　　معرفت ہو اس سے حاصل والسلام

اس سے بہتر ان کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

میر حیات اسی طرح نثر بھی سادہ، آسان اور عام فہم لکھتے ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اے عزیز دوستو نماز کرنے کا یہ طریقہ ہے، پہلے ان باتوں کو دل میں

جائے دینا اور وقتِ نماز کے پیش نظر رکھنا ہے، جو کوئی کہ ان باتوں کو فراموش کیا نماز اس کی درست نہیں ہوتی، اول یہ بات جاننا جو نماز کرنا واسطے رضائے خدا کے ہے۔ دوسری یہ بات جاننا جو اللہ حاضر ہے۔ میرے ساتھ ہے۔ مجھے دیکھتا ہے اور میرے دل کی نیت پر نظر کرتا ہے، تیسرا یہ ہے جو نماز کرنا ہستی پر خدا کے اقرار کرنا ہے اور غیر حق کو نابود جاننا ہے اور چاروں یہ ہے جو نماز کرنے والے کو اللہ قربت دیتا ہے، پانچواں یہ ہے جیسا کہ غلام تقصیر مند آگے صاحب کے اپنے عاجزی اور قصوری بتاتا ہے ویسا بتاتا ہے، چھٹواں یہ ہے جو آگے صاحب کے سر زمین پر رکھنا اپنے گناہوں کی بخشائش کا سبب ہے اور وسیلہ نجات کا ہے" (دستور الایمان)

شاید میر حیات پہلے شخص ہیں جس نے بوصیریؒ کے قصیدۂ بردہ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا، اشعار کی تعداد بھی وہی ہے اور قافیہ بھی وہی، عربی کے ہر شعر کا مضمون اپنے ایک ہی شعر میں بڑی خوبی اور کامیابی سے ادا کیا ہے۔ زورِ بیان اور جوش و خروش کا قریب قریب وہی عالم ہے، اس کے چند منتخب شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؂

اے حلاوت بخش ذکر دوستانِ ذی سلم
اشک آنکھوں سے رواں ہے خون ہو ا میں بہم

اور محمدؐ سرورِ کونین تاجِ انبیاء
بادشاہِ انس و جاں اور مالکِ عرب و عجم

تھا او بہتر ہر نبی سے صورت و سیرت کے بیچ
ہاں نہیں اس کے برابر کوئی در علم و کرم

درک اس کے شان کا عاجز کیا ہے خلق کو
یہ جہاں اور وہ جہاں دونوں ہیں عاجز یک قلم

انبیا مثلِ کواکب ہیں محمدؐ آفتاب
شب کو ہو روشن کواکب روز کو ہوتے ہیں رم
عرصۂ عزت منے اپنے وہ ایسا بے نظیر
ماہ تاباں در کواکب شاہ در خیل و حشم
آتے ہیں اشجار ان کے حکم پر سجدہ کناں
جانب حضرت رواں تھے ساق پر اوبے قدم
انبیاء کو ساتھ لے کر طے کیا ہفت آسمان
فوج میں پیغمبراں کے تو تھا صاحب علم
نعت شہ کا کر وسیلہ ہوں خطا کا عذر خواہ
عمر کی درکار و خدمت اور کہتے مدح و ذم
ہیں نوافل سے لیا نیں آہ زاد و راحلہ
جز نماز فرض و روزہ میں کیا ہوں کام کم
گرہوں عاصی مصطفٰےؐ سے نیں ہوا پیماں شکن
رشتۂ امید کو ہرگز نہ ہو سستی کا دم
نا غنی محروم اس سے نا کبھو دستِ گدا
باغ و صحرا میں اگاوے گل کو جوں بارش کا نم
یا رسول اللہ جز تیرے نہیں مجھ کو پناہ
جب کہ ہو نازل مرے پر موت اور محشر کا غم
عاصیوں کے واسطے رحمت کی جب تقسیم ہو
ہو بمقدار خطا رحمت مجھے بے کیف و کم

کسی عزیز نے میر حیات کے سامنے ایک ہندی بیت پڑھی (یہاں آپ اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں) اور خواہش ظاہر کی کہ آپ اس زمین میں چند ابیات

اور نظم کریں اور فارسی میں اس کی شرح فرمائیں، چنانچہ آپ نے نو ابیات پر مشتمل
ایک نعت فی البدیہہ کہی اور فارسی نثر میں کلبیت کی شرح لکھی، مختصر نامی فارسی
رسالہ اسی مضمون پر مشتمل ہے، اس نعتِ شریف کا مطلع یہ ہے :-

اس پہ صلوات سدا صبح سے شام تلک ؛ نور سے جس کے ہوئے خاص سے لے عام تلک

مہرحیات کی فارسی تحریروں سے ان کی انشا پردازی کی مہارت اور زبان
پر قدرت ظاہر ہوتی ہے، بڑے عالمانہ انداز کی عبارتیں اور مقفیٰ مسجع جملے لکھتے
ہیں، یہاں بھی روانی اور سلاست کا وہی عالم ہے چنانچہ شمع محفل کے دیباچے کی
چند منتخب عبارتیں درج کی جاتی ہیں :-

بیاض وسواد دیباچہ نوبیان معالم ملکوت وسواد وبیاض نکتہ
آرایان عالم جبروت حمد سخن آرائے کہ معدومات اضافیہ را بحرف کن کہ مفتاح خزائن
جود است بعرصۂ وجود نمایاں رسانید ومعلومات ممکنہ را باقتضائے من لدن کہ
مصباح دفائن شہود است مشہود بینایان گردانید۔ فرد

سواد زلف بیلیں وبیاض آں گردن ؛ کہ شرح ظلمت کفر است نور ایماں را

بیاض آفرینش انسان نسبت از طومار ستائش او وسواد گلزار
امکان گیاہ بیست از بہار نیائش او سبحان اللہ جائے کہ خاتم انبیاء حاکم اصفیاء
کہ مظہر اتم ورحمت عالم ورابطۂ حدوث وقدم وواسطۂ وجود وعدم زبان حقائق ترجمان
بحرف ما عرفناک کشود وما عبدناک فرود دیگرے راچہ یارا کہ زبان کشاید وقلم در ثنا
فرساید چہ عجز سرمایۂ ثناست وبود ما برنابودی. تا صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم
اما بعد بر ناظران مبدا ومعاد پوشیدہ مباد کہ ایں مجموعہ ابیات اہل دل مسمی بہ شمع
محفل کہ معاشران مجلس انس را موجب ازدیاد رسائی وسکان صوامعہ قدس را باعث
دل دہی ودلاسائی۔"

لیکن دوسرے فارسی رسائل میں آپ نے سادہ زبان لکھی ہے اور شمع

و قافیہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ شمع محفل سے آپ کے چند منتخب فارسی اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

در فراقت آں قدر زارم کہ مرگ — جست اندر پیرہن ما را نیافت

ہیچ شے خوشتر نباشد در جہاں از حسن خلق — بہر تسخیر جہاں مہر سلیمانی بود

نور مجرد است دلش نام کردہ اند — در اصبعین حضرت رحمان او بود

لب بکشا گرچہ در آں نوش ہاست — کز پس دیوار بسے گوش ہاست

نظم آرائش عالم کہ ز دانش باشد — پیش ارباب خرد مایہ دانش سخن است

قربان او شوم کہ بیاموخت یک سخن — جورش ہزار بار بہ از مہر ما در لبیت

الحذر کن زغیبت مردم — از زنا سخت تر بود غیبت

مسجد میمیاں پیٹو میں مصرع تاریخ تعمیر کا کتبہ لگا ہوا ہے جو آپ کا کہا ہوا ہے

بنای کعبۂ ثانی شدہ ز اسمٰعیل

۱ ۲ ھ ۴ ۹

یہ قطعۂ تاریخ کا چوتھا مصرع ہے جو شمع محفل میں موجود ہے۔

سراج العقائد کی یہ بیت جنوبی ہندستان میں زبان زد خاص و عام ہے: —

عقائد نہیں جس کے تئیں یاد ہے ٭ جہنم میں گھر اس کا آباد ہے

مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ بیت میر حیات کی کہی ہوئی ہے۔

میر حیات کی اہم مثنوی آب حیات کا ایک اقتباس درج ذیل ہے، اس سے آپ کی نظم، زبان، طرز بیان اور مضامین و مطالب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حکایت

کوئی پوچھا چاند کو اے شب چراغ — کیا سبب ہے تجھے سینے میں داغ

شب کو ہے تو روشنی بخش جہاں — دن کے تئیں نہیں کیا سبب اے بھائی جان

چاند سُن کر یوں کہا جب اس کے تئیں — نور ہے سو سور کا میرے بیں نیں

ذات میری سر بسر بے نور ہے — عیب نقصاں اس میں بس معمور ہے

صاف ہوں میں جس طرف اے راز جو — آئینہ خورشید کا ہوتا ہے جو

اک سراپا آئینہ ہوں میں کثیف — عاریت اک نور ہے مجھ میں لطیف

سور کی مجھ میں چمک ہر آن ہے — جس طرح سے آئینے کی شان ہے

بود میرا سر بسر نابود ہے — نقش میں ہوں نور سو مشہود ہے

سور ہے مختار میں مامور ہوں — اختیاری میں سدا مجبور ہوں

آئنے سے ہے ظہور اس نور کا — عیب میرا اور ہنر اس سور کا

میر حیات نے ویلور میں تعلیم حاصل کی تھی اور ملک العلماء علامہ باقر آگاہ سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ ان کی مثنویاں آپ کی نظر سے ضرور گزری ہوں گی، غالباً وہی آپ کے تصنیفی کارناموں کی محرک ہوئیں، مولوی عبدالحی واعظ بنگلوری احقر نے بھی مدرسہ لطیفیہ ویلور ہی میں تعلیم حاصل کی اور وہاں سے فراغت کے بعد اپنے دورانِ قیام بنگلور میں متعدد ضخیم دینی مثنویاں تصنیف کیں، ان کی مقدار میر حیات کی مثنویوں سے بہت زیادہ اور معیار اونچا ہے، لیکن اولیت کا سہرا میر حیات کے سر ہے۔ عبدالحی میر حیات کے بعد ویلور گئے، تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ان کے بعد شروع کیا اور دونوں کے سال وفات میں بیس سال کا فرق ہے

قادر باری اور اُس کا مُصنف

سلطنتِ خداداد کی عام بول چال کی زبانیں دکھنی، کنڑا اور مرہٹی تھیں، لیکن سرکار کے دربار میں اکثر وبیشتر فارسی کا استعمال ہوتا تھا، دفتر میں فارسی کنڑا اور مرہٹی تینوں کا رواج تھا، فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا، حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں بادشاہوں کے عہد میں خط وکتابت اور مراسلت اسی زبان میں ہوتی رہی، شہادت سے چند سال قبل ٹیپو سلطان نے دفتر کے لئے بھی فارسی زبان لازمی کر دی تھی، چنانچہ حساب کتاب بھی اسی زبان میں لکھا جانے لگا۔ دربار میں قصیدے اور قطعاتِ تاریخ فارسی ہی میں کہے جاتے تھے، سلطان کے سارے مکاتیب فارسی میں ہیں، جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے لئے عموماً فارسی کا استعمال کیا گیا، البتہ سلطان نے دو ایک دینی کتابیں عوام کے لئے دکھنی میں لکھوائیں اور سلطنتِ خداداد کے طول وعرض میں کئی شعراء اور مصنفوں نے اپنے اظہارِ خیال کے لئے زبانِ دکھنی (جو اس سے پہلے دکن کی اسلامی سلطنتوں میں ادبی زبان بن چکی تھی) کا استعمال کیا۔ دربارِ حیدری کے میر منشی لالہ مہتاب رائے سبقت نے جو بڑے جادو نگار منشی اور اچھے شاعر تھے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کی اور دربارِ سلطانی کے ملک الشعراء حسن علی عزت نے فتح نامہ دکھنی میں لکھا، آپ نے سلطان کی فرمائش پر فنِ موسیقی پر جو کتاب مفرح القلوب لکھی اس میں بیانات تو فارسی میں لکھے مگر رقص وسرود کی محفلوں میں گانے کے لئے اس میں فارسی غزلوں سے زیادہ دکھنی غزلیں اور نظمیں شامل کیں، تاہم سرکار و دربار پہ فارسی ہی کا قبضہ رہا سلطان نے سلطان التواریخ، زبرجد، فتح المجاہدین وغیرہ فارسی میں لکھوائیں،

یہاں تک کہ میر زین العابدین شوستری سے آپ نے سال بھر کے لئے منظوم خطباتِ جمعہ کا جو مجموعہ مؤید المجاہدین کے نام سے تیار کرایا وہ بھی فارسی میں ہے، دراصل سینکڑوں برس سے فارسی کو شمالی ہند اور دکن کے اسلامی درباروں میں سرکاری زبان کا رتبہ حاصل رہا اور یہی سلسلہ سلطنتِ خداداد میں بھی جاری رہا، بلکہ زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد بھی مہاراجہ میسور اور انگریز ریسیڈنٹ کے دفاتر میں فارسی کا استعمال برسوں تک جاری رہا یہاں تک کہ انگریزی نے اس کی جگہ لے لی، مہاراجا کے دربار اور انگریز گورنروں کے مابین خط وکتابت مدتوں تک فارسی میں ہوتی رہی، چنانچہ ان خطوط کے کچھ مسودے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہیں۔

حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان دونوں کے دورِ حکومت میں ایرانیوں اور ایرانی نسل کے لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جس طرح دلی، لکھنو بیجاپور، گولکنڈہ وغیرہ کی اسلامی سلطنتوں میں جاری تھا، ایران اور ہندوستان کے دوسرے مقامات سے فارسی بولنے والے سری رنگ پٹن آتے اور ان میں سے اکثر یہیں مقیم ہوجاتے تھے، چنانچہ یہاں ان کی کافی تعداد جمع ہوگئی تھی، سرکار و دربار میں ان کو کافی رسوخ حاصل تھا۔ یہ لوگ مختلف مناصب پر مامور تھے، ان میں سے کچھ معلم بھی تھے، نواب حیدر علی خاں نے سنہ ۱۱۷۹ھ میں کریم خاں زند والیٔ ایران کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ خواہش ظاہر کی کہ دونوں سلطنتوں کے مابین برادرانہ روابط اور دوستانہ تعلقات قائم رہیں اور باہم بندرگاہوں کا تبادلہ کرلیا جائے۔ یہ خط آپ نے والیٔ ایران کے خط کے جواب میں لکھا تھا جو شاید آپ کے پہلے خط کے جواب میں آیا تھا، یہ خط ایران سے ایک وفد لایا تھا جو شاہ نور اللہ، مرزا محمد سلیم اور زین العابدین خاں پر مشتمل تھا، اس خط کا مسودہ جولالہ مہتاب رائے سبقت نے تیار کیا تھا سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے۔

صاحب نشان حیدری میر حسین علی کرمانی اور سلطان کے میر منشی

میر زین العابدین شوستری بھی ایرانی اور فارسی بولنے والے طبقے ہی سے تعلق رکھتے تھے، موخرالذکر شوستری میر عالم حیدر آبادی کے بھائی تھے اور یہ خاندان ایرانی الاصل تھا اسی طرح دربارِ سلطانی اور دربارِ کابل کے مابین بھی مراسلت کا سلسلہ قائم تھا، ایرانی عموماً شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ اور سری رنگ پٹن میں شیعہ سُنّی نزاع بھی ہو جاتی تھی جسے حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان بڑی سختی کے ساتھ دبا دیتے تھے، سنہ ۱۱۹۸ھ میں حیدر علی خاں نے اپنے چند وکیلوں کو شیراز دار الحکومت ایران بھیجا جو کریم خاں والیٔ ایران کی اجازت سے ایک ہزار سپاہی بھرتی کرلایا، لیکن یہ سپاہی کسی کام کے نہ نکلے اِن میں سے کچھ ایران لوٹ گئے اور باقی یہیں کے ہو رہے، کریم خاں ۱۱۶۳ھ سے ۱۱۹۳ھ تک ایران کا بادشاہ رہا، اس نے شاہ کا لقب تک اختیار نہ کیا، شیراز اس کا دار الحکومت تھا، بڑا منصف مزاج حاکم تھا۔ خوش مزاج تھا اور سپاہ و رعیت کی خوش حالی میں ہمیشہ کوشاں رہتا تھا، اس کے زمانے میں شیراز کو بڑا امن اور بڑی خوش حالی میسر رہی، لوگ عموماً خوش حال زندگی بسر کرتے تھے۔ شیراز کے یہ سپاہی سری رنگ پٹن آکر کیا جوہر دکھاتے، حیدر علی خاں کی یہ سعی لاحاصل ثابت ہوئی۔

صاحبِ نشانِ حیدری نے لکھا ہے کہ (شاید سنہ ۱۲۱۰ھ میں) ایران کا ایک شہزادہ اپنے سلطان سے خفگی کے باعث ایک خواجہ سرا کے ساتھ فرار ہو کر ٹیپو سلطان کی پناہ میں آیا، سلطان نے اس کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور سال دو سال اپنے یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا، جب وہ ایران جانے لگا تو سلطان نے شاہانہ خلعت، اسباب اور زادِ سفر مرحمت فرمایا اور تاکید کی کہ آپ اپنے دار السلطنت میں متمکن ہو جائیں تو ہم آپ اور زماں شاہ والیٔ کابل تینوں مل کر ہند اور دکن کے معاملات پر متحدہ اور متفقہ طور پر توجہ کریں گے۔ لیکن سلطان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شہزادہ کون تھا، اس کا نام کیا تھا، اس زمانے میں آغا محمد خاں خواجہ سرا قاچار بادشاہ ایران کے تختِ سلطنت پر جلوہ افروز تھا،

۱۲۱۱ھ میں اسے قتل کر دیا گیا تو تخت کے کئی دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے اور خانہ جنگی
کی نوبت آ گئی، پھر فتح علی شاہ قاچار تخت نشیں ہوا، شاید یہ شہزادہ انہیں تخت کے
دعویداروں میں سے ایک تھا، بہرطور اس واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایرانیوں کی
آمد و رفت دربارِ سلطانی میں تھی

ٹیپو سلطان نے زماں شاہ والی کابل سے فوجی امداد کی درخواست
ایک سے زیادہ بار کی تھی، شمالی ہند کے اسلامی درباروں نے بھی اسی طرح مرہٹوں کے
خلاف زماں شاہ سے مدد چاہی تھی اور زماں شاہ امیر کابل ہندوستان آنے پر آمادہ
تھا، چنانچہ اس نے لارڈ ولزلی، گورنر جنرل کلکتہ کو لکھا کہ وہ ہندوستان آ رہا ہے،
انگریزی فوج مرہٹوں کی سرکوبی میں اس کی مدد کرے۔ ولزلی بہت پریشان ہوا
اور اس نے برطانوی حکمتِ عملی سے کام لے کر زماں شاہ کی راہ میں رکاوٹیں حائل کر دیں
بوشہر میں ایک چالاک ایرانی مہدی علی خاں انگریزوں کا خفیہ ایجنٹ تھا، ولزلی
کے ایما پر اس نے دربارِ ایران میں اپنی سلسلہ جنبانیوں کا جال بچھا دیا۔ اس نے
یہ رپورٹ دی کہ لاہور میں سنی افغانوں نے شیعوں پر اتنا ظلم ڈھایا ہے کہ ہزاروں
گھرانے تباہ و برباد ہو گئے، ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے علاقے میں پناہ دی
ورنہ ان کی جان کے لالے پڑ جاتے، اس موقع پر شاہِ ایران کسی طرح امیر کابل کو
ہندوستان آنے سے روک دیں یہ خدا اور عالم انسانی کی بڑی عظیم خدمت ہوگی، چنانچہ
فتح علی شاہ قاچار والی ایران زماں شاہ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا اور اس سے
الجھ گیا، اس طرح امیر کابل کا پروگرام عمل در آمد نہ ہو سکا، ولزلی نے مہدی علی خاں
کو اس کارکردگی پر انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا

اس تمہید سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ سلطنتِ خداداد میں
فارسی کا کیا مقام تھا اور اس کے رواج کے محرکات کیا تھے، درس و تدریس بھی
عموماً فارسی زبان و ادب ہی کی ہوتی تھی، سلطنت کے طول و عرض میں کچھ سرکاری

اور نیم سرکاری اور اکثر و بیشتر خانگی مدارس جاری تھے جہاں لائق و فائق اساتذہ زبان و ادب، دینیات اور دیگر علوم و فنون کا درس دیتے تھے، عام بول چال کی زبان دکھنی تھی اس لئے وہی ذریعہ تعلیم بھی تھی، "فادریاری" کے مصنف میر فیاض عسکری بھی سری رنگ پٹن یا ظفر آباد کے مقیم ایک ایرانی الاصل مدرس تھے، شیرازی کہلاتے تھے، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شیراز سے وہ آئے تھے یا ان کے آباء واجداد، یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ یہاں کب سے مقیم تھے۔ البتہ چند مآخذ سے اتنی معلومات ضرور حاصل ہوتی ہیں کہ وہ سری رنگ پٹن میں مدرسی کرتے تھے اور ایک ذاتی خانگی مدرسہ کھول رکھا تھا، مثنوی نقش مراد کے مصنف منشی میرزا زین العابدین عابد میسوی نے جو عہد سلطانی میں سری رنگ پٹن کے فوجی دفتر میں بخشی تھے انہیں سے درس لیا تھا۔ عابد کے صاحبزادے مرزا مہدی نے اپنے مجموعۂ انشاء خلاصہ فصاحت میں اس کی صراحت کی ہے، یہ مخطوطہ اس خاندان میں موجود ہے خود فیاض عسکری نے اپنی کتاب انشائے عسکری کی ابتداء میں لکھا ہے۔

"اما بعد میر فیاض عسکری تخلص فطنت برخے بر درس بعضے تلامیذ پر تمیز درفن انشاء و علم عقائد و فقہ مقید بود"

آپ کا تخلص فطنت تھا، شعر بھی کہتے تھے، لیکن آپ کا کلام نہیں ملتا انشائے عسکری میں ایک پر لطف قطعہ ملتا ہے مگر یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپ ہی کا کہا ہوا ہے قطعہ ہے ؎

شیخ جی اشرفی خدائے شماست ؛؛ روپیہ نیز مصطفائے شماست
چار دانگیکہ یک فلوس بود ؛؛ چار یاران باصفائے شماست

زوال سلطنت کے بعد آپ بھی سری رنگ پٹن سے میسور آگئے اور یہیں کے ہو رہے، آپ کا گھرانا میسور میں آج بھی فیاضی خاندان کے نام سے مشہور ہے اور ایک عاشور خانہ بھی آپ کے نام سے موسوم ہے۔ فادریاری آپ نے سنہ ۱۲۱۰ھ میں سری رنگ پٹن کے دوران قیام میں لکھی، آخری بیت میں سال تصنیف یوں لکھا ہے

دوسو بنتیاں یہ میں کہا ہوں بس ∴ سن تھا یک ہزار دوسو دس

اس کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عہد ٹیپو سلطان شہید کی تصنیف ہے جو دارالسلطنت پٹن میں لکھی گئی۔ یہ امیر خسروؒ کی خالق باری کی طرز پر لکھی ہوئی ایک نہایت ہی مختصر فارسی دکھنی لغت ہے جو شاید بچوں اور مبتدیوں کے لئے لکھی گئی، اسی طرز پر اشرف الدین حیدر آبادی نے واحد باری سید محمد والہ ارکاٹی نے رازق باری رام راؤ حیدر آبادی نے مالک باری اور میر شمس الدین فیض نے فیض جاری لکھی، لیکن یہ سب قادر باری کے بعد لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ اور کئی مصنفوں نے ایسی منظوم لغاتیں پیش کی ہیں مگر غالباً امیر خسرو کی خالق باری کے بعد فیاض کی قادر باری ہی کا نمبر آتا ہے، اس میں دوسو ابیات ہیں اور عربی اور فارسی کے چارسو کے لگ بھگ الفاظ کے معنے دکھنی میں بتائے گئے ہیں، یہ لغات رازق باری کے ساتھ مدراس میں چھپ چکی ہے، میں یہاں نمونے کے طور پر چند ابیات پیش کرتا ہوں۔

قادر، باری، اسم صفات	اللہ خدا ہے نام ذات
رسول، مرسل، بھیجے گیا	عصمت، پاکی، شرم، حیا
وصی، خلیفہ، نائب جان	زہرا روشن، سفید، پچھان (پہچان)
حسنؓ حسینؓ ہے مردم نیک	مہر، میا ہے قاصد، پیک
(بیٹھنے والے) بیٹھن ہارے، ملکو اصحاب	رحم، تلطف، غصہ، عتاب
کھانا طعم ہے روٹی نان	بگین کا ناؤں بادنجان (نام)
(ساگ) ترشک، چکہ، اسبیں، سوی (سویا)	قاشق، چمچہ، کفچہ، ڈوی
کاسہ سر کا کھوپری جان	بالاں، موے وشعر، پچھان
جان شقیقہ، کنپٹی	سنگ ہے پتھر خاک، مٹی (پتھر)
(آنکھوں) حلقہ گھر ہے آنکھاں کا	دنداں، نام ہے داتاں کا (دانتوں)

ضرس ہے داڑ (داڑھ) ہور جیب (جیبھ) زباں | اشک ہے آنسو، موں ہے دہاں (منھ)

موں (منھ) کوں (کو) کہتے ہور (اور) دہن | ٹھڈی (ٹھوڑی) زنخداں ہور ذقن

مٹھی بے شک ہیگی (ہوتی) مشت | گا ذرا دھوبی پیٹ (پیٹھ) ہے پشت

پسناں، چوچیاں، پیٹ شکم | ناف ہے بوہنی، پاؤں قدم

پہلو پسلی، شانہ کنگوئی (کنگھی) | دودہ کا جل ہیل سلائی

مچھیاں شارب ہور (اور) بروت (مونچھوں) | خوک ہے مینڈک، مچھی (مچھلی) حوت

دود (دودھ) کے لوٹے کو دوشہ بولتے | ہے ترازو جس سے میزاں تولتے

دھییں (دہی) کی ہنڈی (ہانڈی) کا وشی، پھر لبست بیس ۲۰ | چہل کو چالیس ۴۰ کہتے سی کو تیس ۳۰

روغن زرد ہے گھیو گھی کو تمیں (تم) | تو ہے توں ہور من ہے ہیں ماباں ہمیں

نشہ گھی کو ماپنے (ناپنے) سو ہے پڑی (ایک پیمانہ) | سلک کا ہے عقد کا معنا لڑی

باقلہ، بلّر مسور ہیگا (ہوگا) عدس | ماہ مہینا، سال کوں کہتے برس

کہہ سینتا پھل کو شریفہ اے عزیز | جان کٹھل کوں، پھنس کوں کر تمیز

بنا کا ماٹی ہور ہے معمار (مزدور) | کہہ بڑھئی کے تئیں کہہ ہے نجار

بھان ہمشیرہ (بہن) برادر بھائی ہے | جنگ نام باجا، ہیگا (ہوگا)، بانس ہے نے

پھر مگس مکھی، ملخ، ٹڈا سمج (سمجھ) | مور، چمٹی (چیونٹی) ہے پریشانی حرج

بیضہ انڈا پھر نخود ہے ہربرا | باندار، بوزینہ مضطر، گھابرا (گھبرایا ہوا)

صدر و سینہ چھاتی ہے | پنت ہے صفرا جھنڈ فاقے

عاج ہاتھی دانت ہے ہاتھی ہے فیل | پھر کدالی ہے کلنگ، پھوڑا (پھاوڑا) ہے ببل

شش کا معنا پھیپھسا، ہڈ استخواں | جان مغز استخواں کا گد نشاں

طلق ابرک، نان خورش ہے سالنا (سالن) | مہد، گہوارے کوں کہتے پالنا

بہ لغت دو بحروں میں لکھی گئی ہے، دوسری بحر جہاں شروع ہوتی ہے
وہاں "وزن دیگر" کی وضاحت کر دی گئی ہے، آخر میں دنوں اور مہینوں کے نام اور
ان کے بعد چودہ معصوموں کے اسمائے گرامی یوں نظم کئے گئے ہیں
چودہ معصوم کے نوں سن اب نام ۔ قبر و محشر میں جن سنتی ہے کام ۔
آخری بیت یہ ہے جس میں مصنف کا نام بھی آگیا ہے ۔
سب پو میری طرف سے ہووے سلام :۔ ان کا فیاض عسکری ہے غلام
میں عرض کر چکا ہوں کہ قادر باری مدارس میں طبع ہو چکی ہے، اس
کے مخطوطہ نسخے حیدر آباد کی مخطوطہ لائبریریوں میں موجود ہیں، کتب خانہ سالار جنگ
کی فہرست مخطوطات اردو میں ہاشمی صاحب نے ان کا نام غلام عسکری فیاض بتایا
ہے اور کتب خانہ آصفیہ کی فہرست مخطوطات اردو میں لکھا ہے کہ فیاض عسکری
جنوبی ہند کے باشندے تھے، صاحب علم و فن تھے، عربی فارسی کے عالم اور فن
لغت کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے، خدا جانے ان کو فیاض کے بارے میں یہ معلومات
کہاں سے فراہم ہوئیں، اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، جامو میسور میں اس کے تین
نسخے ہیں، ان میں سے ایک اسی زمانے کا ہے اور دوسری رنگ پٹن میں نقل ہوا ہے
میں نے مذکورۂ بالا ابیات اسی سے نقل کئے ہیں
قادر باری کے علاوہ فیاض عسکری کی اور دو تصانیف اورنٹیل
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں موجود ہیں اور دونوں فارسی میں ہیں، ایک انشائے عسکری
ہے اور دوسری انشائے جعفر، دونوں فارسی انشا پردازی کے عمدہ نمونے ہیں
درس کے لئے مکاتیب، عرضیاں، تمسکات، رسائل، ضمانت نامے، اجارہ نامے
اقرار نامے وغیرہ ان میں جمع کر دئے گئے ہیں، ان کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ الفاظ
اور علمی اور فنی اصطلاحات کی تشریح اور طرز استعمال کی توضیح اور تفہیم

کی گئی ہے ۔ حوالے فرہنگ رشیدی، کشف اللغہ وغیرہ کے مرقوم ہیں۔ بعض رقعے بے نقط بھی ہیں، ان سب سے مصنف کی قدرت زبان اور لغوی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے ۔سال ۱۲۰۵، ۱۲۰۷، ۱۲۰۹ وغیرہ مذکور ہیں، حساب بہادری ہون کے سکے سے لگایا گیا ہے جو عہد سلطنت خداداد کا ایک سکہ تھا ۔ ظفر آباد یعنے سری رنگ پٹن کا ذکر موجود ہے اور اس کے چند محلوں کے نام لئے گئے ہیں ۔ دونوں مجموعے مرزا غلام جعفر کے لئے لکھے گئے ہیں شاید وہ مصنف کے صاحبزادے یا عزیز شاگرد ہوں گے ۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتابیں مصنف نے کب اور کہاں لکھیں غالباً ٹیپو سلطان شہید کے عہد میں سری رنگ پٹن ہی میں لکھی ہوں گی

ایک اہم کتبہ

مسجدوں کے کتبے عموماً عربی، فارسی اور اردو میں ہوتے ہیں اور مندروں کے کتبے سنسکرت یا کسی اور ہندوستانی زبان میں۔ لیکن قدیم ریاستِ میسور میں دو مسجدیں ایسی موجود ہیں جن کے کتبے مقامی زبان کنڑا میں کندہ ہیں اور سینکڑوں برس سے ان مسجدوں میں نصب شدہ موجود ہیں ممکن ہے ملک کے دوسرے حصّوں میں بعض اور مسجدیں بھی ہوں گی، جن کے کتبے عربی، فارسی اور اردو کے سوا کسی اور دیسی زبان میں ہوں گے اور شاید بعض مندروں کے کتبے عربی، فارسی یا اردو میں ہوں گے۔ اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ یہ آثارِ قدیمہ کے محکمے والے ہی بتا سکیں گے۔

سنا ہے کہ دہلی میں قطب مینار پر قرآنِ مجید کی آیتوں کے علاوہ کچھ سنسکرت عبارتیں بھی کندہ ہیں البتہ ہماری ریاست کی ان دو مسجدوں کے کتبے خود میں نے دیکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ نہایت اہم ہے اور اسے ایک خاص تاریخی اور ثقافتی حیثیت حاصل ہے۔

ریاستِ میسور کے شمال مغربی ضلع شیموگہ میں سوررب نامی ایک قصبہ ہے جو ملناڈ یعنی علاقۂ باراں میں واقع ہے۔ نواب حیدر علی خاں بہادر کے عہدِ حکومت میں انہیں کے ایما پر مقامی عامل بیگ نامی شخص نے یہاں جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مسجد قلعے سے قریب واقع تھی جس کے آثار ابھی باقی ہیں، اس کے اخراجات کے لئے اس نے کچھ اراضی بھی وقف کی اور اس پر کنڑا میں ایک چھوٹا

سا سنگین کتبہ نصب کرادیا۔ یہ کتبہ آج کل مسجد کے پاس ہی رکھا ہوا موجود ہے، اس کی کنڑا عبارت کا ترجمہ یوں ہے ۔

"معلوم ہا دکہ حضرت نواب صاحب کے حکم کے مطابق جب بیگ اس قصبے میں آیا اور قلعے میں مقیم رہا تو اس نے رشالی داہنا سال ۱۶۸۹ میں یہ جامع مسجد تعمیر کرائی اور اس کے لئے جاگیر بھی وقف کی جو ہمیشہ رہے گی

مخدوم اللہ

مسجد حیدر علی خاں کے عہد میں تعمیر ہوئی تو آپ نے یا آپ کے عامل نے عربی، فارسی یا اردو میں کتبہ کیوں نہیں لگوایا، کتبے کے لئے کنڑا زبان کیوں استعمال کی ؟ جس سے مسلمان عموماً ناواقف تھے۔ اس کی توجیہہ یوں ہوسکتی ہے کہ نواب صاحب اور ان کے عامل اکثر و بیشتر جنگ و جدل اور حرب و ضرب میں مصروف رہے، کسی تعمیر پر کوئی خاص توجہ نہ دے سکے۔ یہ کام عموماً مقامی اہلکاروں نے انجام دیئے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ نواب صاحب نے کتبے کے لئے عام مقامی زبان کا استعمال کیا، جس میں قلعوں، تالابوں، مندروں اور محلوں وغیرہ کے ہزاروں کتبے اس علاقے میں نظر آتے ہیں، لسانی تعصب نہ برتا اور فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ بہرطور یہ کتبہ اپنی نظیر آپ ہے اس میں مسجد کا سال تعمیر ۱۶۸۶ شالی داہنا لکھا ہے جو ۱۷۶۷ء کے مطابق ہے ایویں بھی قدیم ریاست میں نواب حیدر علی خاں بہادر کے عہد کا کوئی کتبہ فارسی، عربی اردو میں نہیں ملتا۔ البتہ آپ کے دورِ حکومت کے کئی کنڑا کتبے موجود ہیں، جن میں آپ کا نام نامی اور وقف و رفاہ عام وغیرہ کا ذکر ہے۔ صرف رائچور ضلع میں کپیل نامی مقام پر قلعے میں اور کنویں پر دو فارسی کتبے موجود ہیں جو قلعدار محمد خاں بہلی اور محمد عثمان کولاری نے آپ کے حسبِ حکم کندہ کرائے ہیں ۔

نواب صاحب کے دورِ حکومت کے اس کتبے کا حال یونہی بر سبیلِ تذکرہ بیان کر دیا ہے۔ یہ تو صرف دو سو سال پرانا ہے۔ میرا اصل موضوع ایک اور کنڑ کتبہ ہے جو ایک اور مقام کی قدیم مسجد پر نصب ہے اور قریباً ساڑھے چار سو برس کا ہے۔ میں نے اس کا ذکر سنا تو رائس کی اپیگرافیا کرناٹکا یعنی فہرستِ کتبات میں اس کی تلاش کی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ رائس نے اس پر کافی توجہ نہیں دی، کچھ الفاظ چھوڑ دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ کتبے میں یہ الفاظ مٹ چکے ہیں اس کے بعد میں خود اس مقام پر دو تین بار گیا۔ ہوا یہ تھا کہ ہر سال مسجد کی سفیدی کرائی جاتی تو اس پر بھی چونا چڑھا دیا جاتا۔ یوں اس پر چونے کی موٹی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ میں نے اسے صاف کرایا تو جو الفاظ رائس کے یہاں حذف ہو گئے تھے وہ تو واضح ہو گئے لیکن کچھ اور الفاظ غائب ہو گئے تھے جو رائس کے یہاں مذکور ہیں۔ تیسری مرتبہ میں اپنے ساتھ جامعہ میسور کے انڈیالوجی ریڈر کو بھی لے گیا۔ انہوں نے اس کا فوٹو لے لیا اور کتبہ پڑھنے میں اور اس کا ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔

شہر میسور کے شمال میں ٹمکور کی راہ پر ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک متوسط درجہ کا گاؤں سندگھٹا نامی مشہور تیرتھ گاہ میلکوٹے اور کرشنا راج پیٹھ کے درمیان شاہراہ سے ہٹا ہوا واقع ہے۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی ہے اور یہ مسجد اسی گاؤں میں واقع ہے۔ مسجد کی اصل عمارت سنگین اور بالکل ہندو ستانی طرز کی ہے اس کے علاوہ تین اور مسجدیں ہیں جو ریاستِ میسور کے مختلف مقامات پر اسی طرز پر بنی ہوئی میں نے دیکھی ہیں۔ ایک چکمگلور میں جس کے ایک ستون پر فارسی کتبہ ہے اور دوسرے پر کنڑ کتبہ، فارسی کتبے میں مادہ تاریخ والا مصرع مٹ چکا ہے۔ دوسری ہاسن کی سنگین مسجد ہے اور تیسری بنگلور میں سر قاضی صاحب کی مسجد تھی جسے منہدم کر کے عالیشان پیمانے پر دوبارہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی جنوبی ہند میں آمد کا ابتدائی زمانہ تھا مسلمان تو یہاں آکر آباد ہو گئے تھے مگر ان کی طرزِ تعمیر بہت دیر سے آئی، چنانچہ یہ مسجدیں اس زمانے میں ہندوستانی طرزِ تعمیر پر بنائی گئیں۔ سند گھٹہ کی مسجد کے صحن میں مشرقی جانب بیذنہ بھی موجود ہے، اس کی دیوار میں یہ کنڑ اکتبہ ایک معمولی پتھر پر کندہ کیا ہوا موجود ہے جو ڈیڑھ فٹ چوڑا اور ساڑھے تین فٹ لمبا ہے۔ اس پر ساڑھے چار سو برس گذر چکے ہیں اور اس پر چونے کی تہیں چڑھ چکی ہیں صاف کرانے پر معلوم ہوا کہ کچھ حروف مٹ بھی چکے ہیں۔ یہ سو فیصد ہندو کتبہ ہے اور مقامی ہندو حاکم نے نصب کرایا ہے اس کی پیشانی پر ایک طرف ہلال کا نقش ہے اور دوسری طرف سورج کا۔ عبارت کا آغاز سوستا شری سے ہوتا ہے۔ جس طرح دوسرے سنسکرت اور کنڑ اکتبوں کا ہوتا ہے۔ پہلے کنڑا میں مسجد کا سالِ بنا، بانی کا نام، مقامی حاکم کا نام، وقف وغیرہ کا بیان ہے۔ آخر میں سنسکرت میں کچھ شلوک رقم ہیں جن میں نیکی اور اخلاق کا بیان ہے۔ کتبہ کا ترجمہ یوں ہے۔

"خیر باد، شالی واہنا سکھا کے فتح و کامرانی والے سال سے شروع ہونے والے جگ کے، ہے وَبُنی نامی سال ۱۴۵۹ کے شردان نامی مہینہ میں بدھوار پانچویں تاریخ کو جو چڑھتی چاندنی کے دور میں آئی، سند گھٹا میں بابوسٹی نے جو سنگین مسجد کا دیوستھان تعمیر کیا ہے، رنگی نایک نے سب کے اتفاق سے اس کے لیئے، بیدلے نواب، شواپور کا گاؤں اور حبیب کا گھر وقف کیا ہے۔ نذر نیاز کی نقد آمدنی بھی اس کے لیئے وقف ہو گی۔ یہ وقف چاند سورج کے قیام تک قائم رہے گا، آئندہ زمانے میں حاکم، پٹواری، مکھیا یا کسی اور شخص نے اس میں خلل ڈالا تو گویا اس نے کاشی بنارس میں اپنے ماں باپ کو قتل کرنے کے گناہِ عظیم کا ارتکاب کیا۔ یہ اس قریبے کے پٹواری ناگیا نے تحریر کیا ہے۔

خیرات کا دروازہ جنت سے بھی بلند تر ہے اس کے مقابلے میں اور کوئی
نیکی نہیں، جس شخص میں حسنِ اخلاق ہو، اُسے سعادت ضرور نصیب ہوگی، دوسروں
کا مال متاع چھین لینے والوں کا انجام برا ہوتا ہے، وہ شخص جو اپنے پاس جو کچھ ہے
دوسروں کو بخش دیتا ہے، وہ ساٹھ ہزار سال زندہ رہتا ہے

اس کتبے کی عبارت سے جو مطالب حاصل ہوتے ہیں، ان سے اس
کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، مسجد بابوسٹی نے تعمیر
کی۔ یہ ایک مسلمان کا نام ہے اگرچہ بظاہر ہندوانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس جماعت کے لوگوں
میں جو اس گاؤں میں اور ریاست کے مختلف اور متعدد مقامات پر آباد ہیں سیٹی کے
لقب کا رواج آج بھی ہے اور بعض خاندانوں میں تو یہ موروثی حیثیت سے چلا
آتا ہے۔ اس کے معنی تاجر یا ساہوکار کے ہیں۔ تعمیر تکمیل کو پہنچ گئی تو مقامی حاکم
نے جو پالیگار کہلاتا ہے اور جس کا نام رنگئی نایک مرقوم ہے، گاؤں والوں کے
یا پنچایت یا اپنے مشیروں کے اتفاق سے شورا پور نامی گاؤں اور حبیب نامی شخص
کا گھر وقف کر دیا اور نذر و نیاز وغیرہ کی آمدنی بھی اسی عبادت گاہ کے لئے مخصوص کر دی
آئندہ زمانے میں کوئی حاکم یا اہلکاران اوقاف میں خلل انداز نہ ہو۔ اس مقصد سے
یہ حکم پتھر پر نقش کر دیا کہ جو کوئی اس کار خیر میں خلل ڈالے گا وہ گویا بڑے ناقابلِ معافی
گناہِ عظیم کا ارتکاب کرے گا جیسے اپنے ماں باپ کو قتل کرنا اور وہ بھی کاشی بنارس جیسے
مقدس مقام پر، مستقبل سے متعلق اس سے بہتر اور کیا انتظام ہو سکتا تھا

کتبے میں سال ہندوستانی مرقوم ہے، سنہ ۱۴۵۹ جگ کا پہلا اور
بارک سال تھا، اس کا نام ہے وَلمبیُ جس کے معنی مبارک کے ہیں۔ سنہ عیسوی سے
مطابقت پیدا کرنے کے لئے اس میں اٹھتر ۷۸ کا اضافہ کرنا چاہیے۔ اس طرح سنہ عیسوی
۱۵۳۷ برآمد ہوتا ہے، قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر سے بہت پہلے اس

مقام پر مسلمان آکر آباد ہو چکے تھے، عبادت گاہ کی تعمیر کا احساس تو سکون و اطمینان
اور امن و امان سے مقیم ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے، چنانچہ ایک مسلمان نے حاکم اور ہندو
باشندوں کی اجازت اور رضامندی سے مسجد تعمیر کرائی اور انہوں نے یوں اوقاف کا
انتظام کر دیا۔ مسلمان لگ بھگ پانسو برس سے یہاں آباد ہیں، اور یہ مسجد بھی برابر آباد
رہی ہے۔ کہتے ہیں جو سال بنایا گیا ہے وہ سال تعمیر نہیں ہو سکتا یہ تو سالِ وقف ہے، یہ
زمانہ اِس علاقے میں اپنی سیاسی ابتری کے لئے مشہور ہے۔ چھوٹے چھوٹے
رقبوں پر مقامی حاکموں کی حکومت تھی جن کو پالیگار کہا جاتا تھا، وہ ہمیشہ آپس میں
مصروف پیکار رہتے تھے، میسور کے راجا کی سلطنت بہت محدود تھی۔ وہ اور دوسرے
سارے پالیگار سلطنت بیجانگر کے باج گزار تھے جو سالانہ خراج بھی ادا کرتے تھے اور
وقتِ ضرورت فوج بھی مہیا کرتے تھے۔ ان دنوں میسور میں ٹیڈا چامراج وڈیر سوم برسرِ
حکومت تھا جو میسور کے راج گھرانے کا پہلا تاریخی راجا گذرا ہے، بیجانگر کی تاریخ کا عہدِ
زرّیں ختم ہو چکا تھا جب کرشنا دیورائے نے اس سلطنت کو انتہائے عروج پر پہنچا دیا تھا
اب وہاں اچھوت رائے کی حکومت تھی اور زوال کا آغاز ہو رہا تھا۔ سلطنت کے دعویدار
خانہ جنگی میں مصروف تھے، بیجانگر سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا، بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ
گولکنڈہ میں سلطان قلی قطب شاہ اور احمد نگر میں برہان نظام شاہ برسرِ حکومت
تھے۔ شاہِ بیجاپور، بیجانگر کے معاملات میں دخل اندازی کر رہا تھا، وزیروں کی بدعنوانیوں
کی وجہ سے پالیگار اور امرا باغی ہوتے جا رہے تھے، تالیکوٹ کی جنگ میں ابھی ربع
صدی باقی تھی۔ جس نے سلطنت بیجانگر کو سلطنت فراموشیدہ بنا دیا۔ اس زمانے
میں سندگھٹا اور اس کے اطراف واکناف والے علاقے کا پالیگار رنگئی نایک تھا
جو اس گاؤں سے تین ہی میل پر نارائن درگ نامی پہاڑی پر رہتا تھا، اس کا
محل سات سنگین فصیلوں میں محصور اور محفوظ تھا جو آج بھی اس کی یاد دلاتی ہیں

سندگھٹے سے صرف چھ میل پر واقع میلکوٹے کا مشہور مندر اور گاؤں بھی ہے اس کے دائرۂ حکومت میں شامل تھا جو سینکڑوں سال سے جنوبی ہند کا مشہور تیرتھ رہا ہے۔ اس سیاسی خلفشار کے زمانے میں! اس ہندو دینی مرکز سے اس قدر قریب مسلمانوں کی آبادی، مسجد تعمیر کرنے کی اجازت اور ہندوؤں کا متفقہ طور پر اوقاف معین کرنا، ہندو مسلمانوں کی ہم آہنگی، رفاقت و محبت اور باہمی رواداری کا بڑا بین ثبوت ہے۔ آج کا ہندوستان اس سے سبق لے سکتا ہے

ممکن ہے کہ قدیم ریاستِ میسور کے علاقے میں اس سے بھی قدیم مسجد بنا ہوں گی، لیکن یہ قدیم ترین اور پہلی مسجد ہے جس کا کتبہ تاریخ کا حامل ہے اس حیثیت سے یہ گویا قدیم ریاست میسور کی پہلی مسجد ہے۔ اس گاؤں میں جو مسلمان آباد ہیں، وہ پٹوے گر کہلاتے ہیں یعنی حریر باف۔ یہی ان کا پیشہ رہا ہے اور اس صنعت کے لئے یہ مقام بہت مشہور رہا ہے، یہ لوگ پیشے کے لحاظ سے اِس نام سے موسوم ہیں اور خود انہوں نے اپنا نام اہلِ جماعت یا جماعتی رکھا اور اس نام سے بھی معروف ہیں سندگھٹا گویا اِس علاقے میں ان کا قدیم مرکز ہے اس کے علاوہ ریاست کے مختلف مقامات پر ان کی آبادی موجود ہے۔ مذہبًا یہ لوگ اہلِ سنت والجماعت ہیں، ان کا دینی احساس بہت گہرا ہے۔ بڑے محنتی اور جفا کش لوگ ہیں۔ ان کا معاشرہ اور سماجی زندگی بہت سادہ اور پُر مسرت ہوتی ہے۔ ان کی اصل زبان مرہٹی تھی، آج بھی سندگھٹا اور دوسرے مقامات پر بڑے بوڑھے یہی زبان بولتے ہیں۔ گو اردو زبان عام بن چکی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ مرہٹی علاقے سے یہاں ہجرت کر آئے تھے۔

عابد میسوری اور نقشِ مراد

مرزا زین العابدین عابد جو عرفِ عام میں منشی عابد کہلاتے ہیں شہر میسور کے پہلے اردو شاعر تھے اور آپ کی تصنیف مثنوی نقشِ مراد اردو کی پہلی کتاب ہے جو اس شہر میں لکھی گئی آپ کے اور آپ کے آباء و اجداد کے کچھ حالات، خلاصۂ فصاحت نامی مخطوطے سے ملتے ہیں جو آپ کے ایک صاحب زادے مرزا مہدی کے فارسی مکاتیب کا مجموعہ ہے اور جو ان کے خاندان میں موجود ہے، یہ اس مجموعے کا تاریخی نام ہے اور اس سے اس کی تاریخ تکمیل ۱۳۰۵ھ نکلتی ہے خود عابد نے اپنی مثنوی نقشِ مراد میں اپنا شجرۂ نسب یہ بتایا ہے

عابد ابن العسکری ابن السمیع ابن تقی یادگار ابن البدیع مرزا مہدی نے لکھا ہے کہ آپ کے جدِ اعلیٰ مرزا بدیع اپنے فرزند یادگار علی کے ساتھ ایران سے نکلے حج و زیارت سے فارغ ہو کر دہلی پہنچے۔ بادشاہ وقت کی قدر شناسی اور کرم فرمائی سے متاثر ہوئے تو بال بچوں کو ایران سے بلا لیا اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔

یہ خاندان ایک مدت تک دہلی میں آباد رہا اور پھر جب دہلی میں بد امنی اور تباہی کا دور دورہ ہوا تو عابد کے والد مرزا عسکری اپنے اہل و عیال کے ساتھ دکن ہجرت کر آئے اور ٹیپو سلطان کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ سلطان نے آپ کو ڈھاڑواڑ ضلع کا میر صدور یعنی قلعوں کی مہمی کے منصب پر مامور کیا اور ظفر پیکر کے خطاب سے بھی نوازا، اس وقت عابد کا سن تیرہ سال کا تھا، مرزا عسکری اپنی وفات تک اس منصب پر بحال رہے، عابد نے اپنے والد ہی سے دینیات اور ادبیات کی تعلیم حاصل

کی، ان کی وفات کے بعد سلطان نے آپ کو سری رنگ پٹن میں غنی کچہری کا بخشی مامور کر دیا، یہ فوج کا ایک دفتر تھا اور آپ گویا اس کے سکریٹری تھے، آپ چھ سال تک یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دیتے رہے ..... یہاں تک کہ ۱۷۹۹ء میں سلطان نے شہادت پائی اور سلطنتِ خداداد کا تختہ الٹ گیا، پٹن کے دورانِ قیام میں آپ نے فاضل مدرس میر فیاض عسکری سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔ جو فادرباری اور انشائے عسکری کے مصنف گزرے ہیں، آپ نے فادرباری خالق باری کی طرز پر ۱۲۴۰ھ میں لکھی تھی اور انشا بھی شاید اسی زمانے میں مرتب کی، ان دونوں کے مخطوطے میسور، حیدرآباد وغیرہ کی مخطوطہ لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

زوال سلطنتِ خداداد کے بعد تین سال عابد نے بڑی پریشان حالی اور مصیبت میں بسر کئے قتل عام اور لوٹ مار سے جو علماء فضلا اور معززین بچ رہے، پٹن سے نکلے اور جنوبی ہند کے مختلف مقامات میں جا بسے دربارِ سلطانی کے ایک منشی اور منجم غلام حسین میسور آ رہے اور راج دربار میں ملازم ہو گئے، آپ کی تصانیف کے مخطوطے بھی اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹوٹ میسور، اور سالار میوزیم، حیدرآباد، میں محفوظ ہیں، میر فیاض عسکری بھی میسور آ گئے، ان کے ساتھ عابد بھی میسور میں آکر بس گئے۔
زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد بھی ایک مدت تک دربار اور سرکار کی زبان فارسی رہی غلام حسین منجم راج دربار میں منشی مامور ہوئے، تو برطانوی رزیڈنٹ ولکس نے عابد کو رزیڈنسی کے دفتر کا میر منشی بنالیا، اس نے تاریخ میسور مرتب کی تو منشی عابد سے بھی کام لیا اس نے لکھا ہے کہ سلطان التواریخ کا نسخہ اسے عابد کے گھر سے ملا اسے انہوں نے بڑی عزت اور حفاظت سے مقفل رکھا تھا، یہ تاریخ غیر مکمل ہے لیکن اس کی اہمیت اس بنیاد پر قائم ہے کہ سلطان کے حکم سے انہیں کے زیر نگرانی اسے دربار میں لکھا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ مدراس کی اورنٹیل لائبریری میں موجود ہے

منشی عابد چند سال رزیڈنسی میں مامور رہے پھر اس کے بعد راج دربار سے متعلق ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ آپ نے مہاراجہ کشن راج وڈیر سوم کو اردو اور فارسی پڑھائی جو ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد تخت نشین ہوئے تھے یہ مہاراجا برطانوی گورنروں، رزیڈنٹوں اور افسروں سے اردو میں گفتگو کرتے تھے، کیوں کہ آپ انگریزی سے ناواقف تھے اور انگریز کنڑا سے نابلد، دربار اور دیوان ریاست کی خط و کتابت برطانوی رزیڈنٹ اور مدراس اور کلکتے کے گورنروں سے فارسی میں ہوتی تھی، اس کے کچھ مسودے سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہیں جو منشی غلام حسین منشی سید حسین وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ حصول ملازمت کے بعد منشی عابد نے میسور میں پچاس سال بڑی فارغ البالی اور شان و شوکت سے گذارے، منڈی محلہ میں ایک وسیع خطہ زمین آپ کو مل گیا جہاں آج ایک محلہ ہی آباد ہے اسے آج بھی منشی محلہ کہتے ہیں، آپ نے اپنے رہائشی مکان سے متصل ایک عاشور خانہ بھی بنالیا جس کا تاریخی نام خود آپ نے رشک بہشت رکھا، اس سے سال بنا سنہ ۱۲۲۷ھ نکلتا ہے۔

میسور کے دوران قیام میں آپ نے فارسی اور اردو دونوں میں کافی تعداد میں مناقب، مراثی اور نوحے وغیرہ لکھے جو یہاں کی مجلسوں میں ہمیشہ پڑھے جاتے تھے، ان کے علاوہ نقش مراد اردو میں آپ کی ایک مبسوط مثنوی ہے، اس میں آپ نے طالب کے عشق اور سلطان مغرب کی دختر کے حسن کی داستان بڑے دلکش اور دلآویز انداز میں نظم کی ہے، لیکن اس کے باوجود ساری مثنوی پر حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کی مدح و عقیدت کا رنگ چھایا ہوا ہے، اس مثنوی میں عابد کے جوہر کھلے ہیں، زبان کی شیرینی، بیان کی رنگینی، روانی، منظر نگاری، پُر لطف تشبیہیں اور استعارے صنائع بدائع وغیرہ ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں قصہ واقعی ہو یا فرضی، اسے آپ نے اصلیت اور حقیقت کا رنگ بخشا ہے، پڑھنے

والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہتا کہ داستان گوئی آپ کا مقصد نہیں بلکہ حضرت شبیرِ خدا کی مدح و ثنا مطمح نظر ہے، زبان نہ خالص دکھنی ہے نہ ٹھیٹ اردو، دونوں کا امتزاج اس میں ملتا ہے، یہ مثنوی میسوری اردو کے اس دور کی آئینہ دار ہے جب دکھنی اور اردو یعنے قدیم و جدید کی کش مکش سی تھی، آپ کے معاصر لطیف ارکاٹی اور جنوبی ہند کے دوسرے ہم عصر شعراء کے کلام سے بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ مثنوی میں ابیات کی تعداد جملہ پانسو سترہ ہے اس مثنوی کو چند ابواب یا فصول پر تقسیم کیا گیا ہے، ہر فصل کا عنوان فارسی نثر میں لکھا ہے، حمد و نعت کے بعد عشق کا بیان کرتے ہوے کہا ہے

بہترین ذکرِ ذکرِ عشق ہے　　　خوشترین فکر فکرِ عشق ہے

سببِ تصنیف یہ بتایا ہے کہ یہ نقل تواتر سے سنی تھی، چنانچہ اسے مدح شبیرِ خدا کے رنگ میں نظم کر دیا اور اس کا نام نقشِ مراد رکھا قصہ یہ ہے کہ کشور مغرب میں طالب نامی ایک خوبرو سادہ دل اور شریف نوجوان سلطان مغرب کی دختر پر عاشق ہو گیا، اس کا یہ حال ہو گیا کہ

عشق سے ایسا ہوا بے اختیار　　　حال اس کا جگ میں پایا اشتہار

تذکرہ ہوتا تھا اس کا گھر بہ گھر　　　تا کہ سلطان تک یہ جا پہنچی خبر

ناصحوں کی نا نصیحت کارگر　　　نا حکیموں کی تھی حکمت کارگر

اس کی دیوانگی کا حال سلطان مغرب نے سنا تو اہل دربار سے مشورہ کیا، کسی نے اسے گردن زدنی قرار دیا، کسی نے جلا وطن کرنے کی رائے دی آخر یہ طے ہوا کہ وہ اگر مدینے جائے اور حیدرِ کرار کا سر لے آئے تو شہزادی اس کے نکاح میں دے دی جائے۔

شبیرِ خدا کی شجاعت مشہور تھی، یقین تھا کہ وہ ان کے ہاتھوں مارا

جائے گا اور یوں اس سے نجات مل جائے گی طالب نے یہ سن کر کہا ؎

مارتا ہوں یا وہیں جاتا ہوں مر   راہ میں معشوق کی دیتا ہوں سر

یہاں شاعر کہتا ہے ؎

واعجب اے واعجب اے واعجب   کس سے لڑنے کو چلا یہ بے ادب

جس کے در پر سرنگوں چرخِ بریں   جس کی دربانی کرے روح الامیں

جنگ کرنا حیدرِ صفدر کے سات   جنگ ہے فی الاصل پیغمبر کے سات

تجکو عاید جستجو کچھ اور ہے   چل ادھر یہ گفتگو کچھ اور ہے

طالب کو حضرت علی کا خیال آتا تھا تو کہتا تھا

حیدرِ کرار حق کا شیر ہے   شیر ہے اور صاحبِ شمشیر ہے

پھر خیالِ یار آتا تو ؎

یہ جو یاد آتی تھی صورت یار کی   اور لطافت لعل و گوہر بار کی

دل کے تئیں رکھتا تھا ہر دم استوار   بولتا تھا یا مروں یا لیوں مار

الغرض روتا دھوتا آہ و زاری کرتا دعائیں مانگتا مدینے پہنچا ؎

کے ہزاراں آفتاں سے ہو کے پار   یارے آ پہنچا مدینے کے دیار

حضرت علی سے ملاقات ہوئی، آپ نے فرمایا ؎

حیدرِ کرار ہے میرا ہی نام   کہہ دے کیا ہیگا ترے تئیں مجھ سے کام

طالب نے جرات کر کے آپ سے مبارزت طلب کی، آپ نے اسے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ کسی طرح باز نہ آیا تو ایک ہی داؤ میں اسے زیر کر لیا اور حلق پر خنجر چلانا چاہا تو وہ زار زار رونے لگا ؎

گرد حسرت دل ستی دھونے لگا   آنکھ سے آنسو بہا رونے لگا

اور کہنے لگا کہ مجھے جلد ذبح کر دیجئے مجھے نجات مل جائے گی اور آپ کا بڑا احسان

ہوگا حضرت علی کو بڑا اچنبھا ہوا، اس کی دل داری کرنے لگے اور حال پوچھا تو اس نے رو رو کر بتایا ؎

دل مرا اٹکا ہے اک دل بر کے سات | ہیگا وعدہ اوس کا تیرے سر کے سات
سر سے تیرے وعدۂ دیدار ہے | سر سے تیرے مجھ کو وصل یار ہے
سر ترا ہے وعدہ میرے یار کا | سر ترا ہے مہر اس دل دار کا
سو تو تیرا سر کہاں اور میں کہاں | اب وصال یار میرے تئیں کہاں

حضرت نے یہ سن کر فرمایا ؎

مدعا تیرا کیا میں نے قبول | سر لجا میرا نہ کر خاطر ملول

بہت اچھا ہوگا میں بند ننگ و نام سے رہا ہو جاؤں گا، مجھے لذت نفسانی اور شہوات جسمانی سے کام نہیں میں جنگ اللہ کے حکم اور رسول اللہ کے دین کی خاطر کرتا ہوں ؎

نامرادی سے بچا یہاں آ کے تو | پھر نہ ایسا وقت پاویگا کبھو

طالب دریائے حیرت میں غرق ہوگیا، عرض کیا ؎

اور کہا اے قبلۂ عرش بریں | آفریں صد آفریں صد آفریں
آفریں تجھ پر ترے آئین پر | مرحبا ہے تجھ پہ تیرے دین پر

میں سراسر نادم اور بہت شرمندہ ہوں، مجھ گناہ گار سے اپنا دل صاف فرما لیجئے مجھے معاف فرما دیجئے، مجھے اپنی غلامی میں لے لیجئے اور اپنے دین کی تلقین کیجئے۔ چنانچہ طالب کو آپ نے مسلمان بنا دیا، پھر اسے لے کر پل بھر میں ملک مغرب پہنچے، فرمایا مجھے اسیر اور قیدی کی طرح سلطان مغرب کے دربار میں لے چل اور اپنا مدعا حاصل کر لے، وہ یہ جرات کرنے کو تیار نہ ہوا، لیکن حضرت کے اصرار پر مجبوراً آمادہ ہوگیا، حضرت کو دربار سلطان میں لے گیا اور شاہ مغرب سے کہا ؎

تو کہا تھا لاوے اوس کے سر کتیں ‏ ‏ دیکھ میں لایا ہوں خود حیدر کتیں

بادشاہ بہت حیران ہوا، سوال وجواب کے بعد سارا حال سن کر اتنا متاثر ہوگیا کہ اس نے بھی مع سارے اہلِ دربار کے حضرت کی غلامی بطیب خاطر قبول کرلی اور سب دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے، اس طرح طالب عشق مجازی کی راہ سے عشقِ حقیقی کی منزل پر پہنچا، یہاں عابد کہتے ہیں ؎

حُبّ حیدر دولتِ جاوید ہے ‏ ‏ حُب حیدر حاصلِ اُمید ہے

اور یہی گویا ساری مثنوی کا ماحصل ہے، آپ نے حکم دیا تو سلطانِ مغرب نے اپنی دختر کو طالب کے نکاح میں دے دیا، اس شادی کا منظر عابد نے بہت خوب پیش کیا ہے اور پر لطف سماں باندھا ہے ؎

جب کیا یہ نیّر شادی شروع ‏ ‏ شاہزادی کی ہوئی شادی شروع

دیکھ کر گلزار عشرت پر بہار ‏ ‏ لے کھڑا خورشید جام زرنگار

آسماں کے سر پہ تھے طبقاتِ نور ‏ ‏ تھے زمیں پر انجمن ہائے سُرور

مجلس انجم پہ ہر دم خندہ زن ‏ ‏ شاہدانِ بزم و شوخانِ چمن

آئینہ خانے میں عکسِ ہر پری ‏ ‏ اصل پر اپنی کرے جادوگری

پرورش میں خواب فرشِ مخملی ‏ ‏ پائے معشوقاں میں لاوے گدگدی

خوبرویانِ ستم افزائے شوق ‏ ‏ گلعذارانِ چمن پیرائے ذوق

بے بہا پوشاک شاہانی سے سات ‏ ‏ نو بنو رخت عروسانی کے سات

سب نے مل اوس رشک خوبانی کنیں ‏ ‏ صدر شاہی پر کئے کرسی نشیں

قصہ کوتہ وہ ہنر پیراستہ ‏ ‏ شاہزادی کو کئے آراستہ

کر کے اوس نازک بدن کو نازنیں ‏ ‏ پردۂ خلوت میں کی خلوت نشیں

کیا وہ خلوت خلوتِ اسرار دوست ‏ ‏ کیا وہ خلوت خلوتِ دیدار دوست

خوابگہ تھا عین بیداری کے ساتھ   میکدہ تھا عین ہشیاری کے ساتھ

حضرت علیؓ نے سب کو مسلمان بنایا، طالب کا عقد نکاح باندھا اور دعائیں دیتے ہوئے مدینہ منورہ لوٹ گئے۔ مثنوی کا قصہ بڑا دل کش اور پر لطف ہے اور عابد کے زبان و بیان نے اسے رنگین بنا دیا ہے

آخر میں بارگاہِ الٰہی میں مناجات کی ہے اور قطعہ تاریخ اسی بحر میں لکھا ہے، مثنوی سنہ ۱۲۱۸ھ میں تکمیل کو پہنچ چکی تھی یعنی زوال سلطنت خداداد کے تین سال بعد اس مثنوی کے دو مخطوطہ نسخے موجود ہیں ایک اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جامعہ میسور میں اور دوسرا جامعہ عثمانیہ کی لائبریری میں دونوں خود مصنف کے دستِ خاص سے لکھے ہوئے ہیں اور ترقیمے میں سال نقل سنہ ۱۲۳۴ھ بتایا گیا ہے، دونوں نسخے اس قدر بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہیں کہ اب الفاظ کی صحیح نقل مشکل سے ہی جا سکے گی

میسور اور حیدرآباد دونوں مقامات کے نسخوں پر ایک شخص علی سلطان طالب نے اپنے ہاتھ سے فارسی میں مثنوی کا دیباچہ لکھا ہے، اس میں لکھا ہے کہ آپ ماہ جمادی الاول سنہ ۱۲۲۳ھ میں مدراس سے یا مدراس کی راہ سے میسور آئے اور کچھ مدت تک یہاں قیام کیا، واپسی پر اپنے ساتھ عابد کا کچھ کلام بطور ارمغان لے گئے یہاں کے دوران قیام میں مثنوی نقش مراد نظر سے گزری تو اسے بہت پسند کیا اور موشح قطع اردو میں اس کی تعریف و توصیف میں لکھا جس سے آپ کا تخلص شاعر کا نام مثنوی کی تاریخ اور دیباچے کی تاریخ سب نکلتے ہیں، مخطوطے کا یہ حصہ بہت کرم خوردہ ہے اور مشکل سے چند شعر پڑھے جا سکتے ہیں، مثلاً

طبع کب کبسہ گردوں سے ہم رکھتے ہیں   ایک ہمت ہے تو سو لاکھ درم رکھتے ہیں

لمزہ آفاق میں ہوتا ہے یہ خوبان دہور   بزم میں مثنوی یہ جیسا پا قدم رکھتے ہیں

حال دل اپنا کہیں کس سے بہر شام و صباح   کہ یہ جو رکھتے ہیں الم رکھتے ہیں

مبدع شعر کی توشیح مجمع کا عشق !!! ردف سے تابردی اہل عجم رکھتے ہیں

اپنی رباعی بھی درج کی ہے

گر مطلب وصل یار جویم مشکل ور کوچہ ہجر او بپویم مشکل

طالب دل را عجب مصیبت پیش است گویم مشکل دگرنہ گویم مشکل

دیباچے میں عابد اور ان کے کلام کی مبالغہ آمیز تعریف لکھی ہے جس طرح

قدیم تذکرہ نگار لکھتے ہیں مثلاً :-

از خدمت فیض درجت قدوہ ارباب تحقیق سالک مسلک تصدیق جویائے

آثار طریق ربانی راہ رو جادہ وصال معانی مجمع الفضائل منبع الشمائل پیرو آئین یقین

مرزا زین العابدین المتخلص بعابد کہ دائم از آوازہ طبع بلند و طنطنہ فکر مشکل پسند ساغر

کش خمخانہ تمنا بود مستفیض و مستفید شدہ غنچہ پژمردہ دل را از نسیم ناطقہ مبتش شگفتگی

داد و بر زخم ہائے جگر پارہ خویش از طراوت بخشی سخن تبنش مرہم نہاد

مرزائے موصوف ہم آں قدر حلاوت بخشید کہ عذب البیانش تحریر می آید و

رطب اللسانش بتقریر می گنجد عجب معنی سنج زمان و سخنور دوران است کہ زبان در توصیف

رنگینی سخن لال و قوت سامعہ را از استماع حرف و حکایتش در استقبال ہمائی فکرش

کہ بر آسمان سخن دائم بلند پرواز است اگر مرغ روحش خوانم بجا است و شہبازہائے سخنش

کہ در بلند پروازی ہوای معانی ممتاز است اگر از طائران او پرندہ شمارم روا

روزی بنود کہ گل خاطر اخلاص مظاہر استشمام گلدستہ سخن نوبہارش

معطر نمی است و شبی بنود کہ غنچۂ دل ارادت منزل بنسیم عنبر شمیم سواد سطور مشک

بارش معنبر نے''

طالب نے مثنوی کی ایک نقل بھی لے لی۔

''سبحان اللہ عجیب مثنوی کہ ہمول وقت از دست خویش رسالہ

مذکور گرفت ''

لکھا ہے کہ اسے ہیں اپنے استادخان صفا مرزا علی لطف اور حسن علی خاں کی خدمت میں پیش کروں گا اس سے قبل بھی عابد کا کلام ان اساتذہ کے پاس پہنچا اور خراج تحسین وصول کرچکا ہے۔

میسور کے مخطوطے میں مثنوی کے علاوہ عابد کے چند اور فارسی نا رجبہ قصائد بھی رقم ہیں جو حضرت مشکل کشا کی مدح میں لکھے گئے ہیں ایک اردو مخمس بھی ہے جس میں میر حسن کی ایک غزل کی تضمین کی گئی ہے۔ چند رباعیاں بھی ہیں اور آپ کے بھتیجے مرزا عسکر حسین کا قطعہ تاریخ بھی درج ہے۔ جو آپ کی وفات پر لکھا گیا ہے اس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

جناب مقدس فلک مرتبت — مسمی بہ عابد بسا متقی

فصیح اللسان شاعر مدح گو — بصد جاں محب علیؓ ولی

وحید زماں فاضل دہر بود — زلبس داد داد سخن گستری

اگرچہ قوی بود شاعر ولی — نفرمود جز مدح آل نبیؐ

لیک و لہجہ اہل ایراں بداشت — عجم زندہ کردہ ز طبع ذکی

غرض آں جناب از فضلائے خدا — رہ خلد بگرفت و شد جنتی

بفرمود ناگاہ ہاتف چنیں — بہشتی شد عابد ز مدح علیؓ

۱۲۶۷ھ

مرزا زین العابدین عابد اپنی وضع داری، وقار، علم و فضل اور فارغ البالی کے لئے آج بھی مشہور ہیں۔ پٹن سے ہجرت کر آنے کے بعد پچاس سال میسور رہیا بڑی شان و شوکت سے زندگی بسر کی، سرکار و دربار میں آپ کو بڑی رسائی اور عزت حاصل تھی، کہتے ہیں کہ علالت کے زمانے میں خود مہاراجہ صاحب میسور آپ

کی عبادت کو آتے تھے، دربارِ میسور میں آپ کی اولاد و احفاد کی بھی ہمیشہ ایسی ہی قدر و منزلت رہی

نقشِ مراد کے علاوہ ایک اور مثنوی جوش و خروش بھی آپ کی کہی ہوئی سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ آپ نے نقشِ مراد کے اٹھائیس سال بعد سنہ ۱۲۴۹ھ میں لکھی تھی، آپ کا ایک مختصر سا دیوان بھی اسی میوزیم کی مخطوطہ لائبریری میں موجود ہے۔ جس میں مدحیہ کلام کے علاوہ کچھ غزلیں بھی موجود ہیں، لیکن غزل میں آپ کا رنگ جمتا دکھائی نہیں دیتا البتہ مدحیہ قصائد اردو فارسی دونوں میں اچھے کہے ہیں، فارسی اور اردو قصیدوں سے نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے عابد کے رنگ سخن اور معیار کلام کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے

خوشی ہے عیش ہے عشرت ہے شادمانی ہے — کہ آج بزم میں ساقی کی کامرانی ہے

زباں نہ کھولئے اس باغ میں کبھو سوسن — جو سوز بان بیاں ہے تو بے زبانی ہے

ہمارے یار کا مت پوچھ وجہ استغنا — غرور حسن ہے ہنگام نوجوانی ہے

نہ پوچھ ہم سے جو رکھتا ہے وہ کنارہ کشی — بنیٹ خیال ہے سر نا بپا گرانی ہے

مری خرابی و دیوانگی و رسوائی — تجھے ہنسی ہے تفنن ہے شادمانی ہے

بسان خامہ تری رہ میں سر کیا ہوں قدم — ہے نقش پا نزا جس جا مری پشانی ہے

قسم ہے باد صبا کی تری گلی میں سدا — ہماری خاک کو معراج لامکانی ہے

سیاہ کار ہوں پر بوئے مشک رکھتا ہوں — ہے چہرہ زرد ولے عرق زعفرانی ہے

ہمارا دل ہے کبھو میر مجلس وحشت — کبھو حریف حریفاں کار دانی ہے

علی ولی کو نبی داور دارین — خدا سے جس کو عطا سیف دو زبانی ہے

شہنشہ سر سر گردگان سرو علن — زمیں سے عرش تلک جن کی حکمرانی ہے

ترے غلام کو ہے مغز خواجگی دو کون — ترے گدا کو دماغ شہنشہانی ہے

نظر ہو عابد کمتر پہ کام بخشی ہے — تری جناب سے امید دو جہانی ہے

قصیدۂ فارسی

گل گرز چمن بکف حنا کن — ایں باغ دگر ز خود بنا کن

بکشا سر زلف عنبر آگیں — منت بہ نسیم جاں فزا کن

بر چیں ز متاع عشق و کاں — تا ذرہ و مہر یک بہا کن

از مطلع در در آ چو خورشید — سلطانی ملک چشم ہا کن

تا چند بگویمت چہا کن — یک جلوہ نما و کار ہا کن

تا چند پے حجاب باشی — بر دار نقاب چشم وا کن

صد بندۂ جہاں بخود بیارا — یک گوشۂ نظر بسوی ما کن

صد پارہ جگر تمام امید — بر ہمت عشق مرحبا کن

تا ہر چہ بگویمت ہمیں است — دل را بہ محبت آشنا کن

صد بارہ بشو زباں بہ کوثر — مداحی آل مصطفیٰ کن

سلطانی شاہ نائب ما — بر عالم ارض بر ملا کن

یا مہدی دیں پناہ برخیز — رایات محمدی بپا کن

برکش ز نیام ذوالفقارت — سر از تن ناکساں جدا کن

شیراں دلیر در کمند اند — بندی بکشا ز ہم رہا کن

پر شور شدہ جہاں ز سگہا — تنبیہ سگاں ناسزا کن

ہر چند زما بجز خطا نیست — عفوی کن و پوشش خطا کن

ہموار مخالفان دیں را — در رنج الیم مبتلا کن

عابد مخروش و بس نگہدار — لب بند و نظر بہ پشت پا کن

بر مقطع ختم ایں قصیدہ — صلوٰت بختم اوصیا کن

درگاہی صاحب میسوری

حضرت درگاہی صاحبؒ کی مسجد شہر میسور کی ایک مشہور و معروف مسجد اور مسلمانوں کا ایک اہم دینی اور علمی مرکز ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ مسجد سب سے پہلے درگاہی صاحب نے تعمیر کرائی تھی یا ان کے قیام کی وجہ سے یہ نام مشہور ہو گیا، البتہ ابھی حال ہی میں جو نئی عمارت اس مسجد کی تعمیر ہوئی ہے، یہ شاید اس مسجد کی چوتھی تعمیر ہے کیونکہ اس سلسلے میں کھدائی ہوئی تو تین قدیم بنیادیں دیکھنے میں آئیں، بہرطور مسلمانوں کی یہ عبادت گاہ آج بھی درگاہی صاحب کے نامِ نامی سے منسوب ہے جب سے بنی ہے آج تک سب سے زیادہ آباد اور بارونق رہی ہے اور رہے گی حضرت مولوی محمد درگاہی صاحبؒ اس کے احاطے کے جنوبی حصے میں مقیم تھے جہاں آج مکرے اور موٹر خانے کھڑے ہیں آپ کا انتقال بھی اسی مکان میں ہوا اور آپ کے بعد آپ کے اولاد و احفاد بھی مدتوں تک یہیں آباد رہی

آپ کے منظوم کلام کا مجموعہ آپ کی یادگار ہے، اس سے آپ کے علمی تبحر کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ حضرت ٹیپو سلطان شہید کے معاصر تھے یا تو زوالِ سلطنتِ خداداد سے پہلے یہاں آ گئے تھے یا اس کے بعد جب سری رنگ پٹن ظفر آباد کے اہلِ علم و فضل ادھر ادھر نکل گئے تو آپ میسور میں ایسے اور یہیں کے ہو رہے۔ قیاس ہے کہ آپ کا انتقال شہادت سلطانی کے بیس پچیس برس بعد ہوا آپ کا مجموعہ کلام کئی جنبشوں کا ملک رہا ہے آپ کی شخصیت

اور عظمت اس سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے، اس زمانے میں میسور میں جیسی اردو رائج تھی اس کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ مجموعہ اس زمانے کے مسلم سماج کی آئینہ داری کرتا ہے، اس کا مطالعہ ہر شوقین آدمی کے لئے نہایت ہی پر لطف، دل چسپ اور معلومات افزا ہوگا

آپ کا مجموعہ کلام جس کا نام اشعار درگاہی ہے۔ ہمارے شعبۂ تحقیق میں موجود ہے مطبع فردوسی بنگلور میں اتنی نفاست کے ساتھ چھپا ہے کہ اسے دیکھ کر دل مسرور اور آنکھیں پر نور ہو جاتی ہیں، سر ورق پر لکھا ہے۔

" ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ

" الحمد للہ کہ ایں اشعار صداقت شعار، مقبول بارگاہِ الٰہی، مولوی محمد درگاہی مہسوری موسوم بہ اشعار درگاہی بصحت تام و اہتمام مالا کلام راجی رحمت رب متین سید امین الدین خلف حافظ سید محمد صاحب مغفور در مطبع فردوسی بنگلور طبع گردید"

صفحات کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے اور جملہ ابیات تقریباً ڈھائی ہزار ہیں، اسے جو اتنی نفاست اور اہتمام سے طبع کیا گیا ہے اس سے اس زمانے میں اس کی جو قدر و قیمت اور مقبولیت ہوگی اور اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ طباعت اور نشر و اشاعت کے میدان میں بنگلور اتنا ترقی یافتہ تھا

حضرت محمد درگاہی صاحب کو شاعر تو نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ آپ کا کلام شعریت سے یکسر خالی ہے، نہ آپ نے خود کہیں اس کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے لحاظ سے آپ ایک اچھے ناظم تھے اور اپنے مطالب کو موزوں کلام میں بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ ادا کئے ہیں، شاید یہ طرز ادا آپ نے اس لئے اختیار کی ہوگی کہ نظم کو بہت جلد اور عام رواج حاصل ہو جاتا ہے اور نثر کی نسبت اس میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ آپ سے پہلے بھی اردو اور فارسی

سے کے مبلغ علما اور صوفیہ نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا، اپنے کلام میں آپ نے جو مطالب جمع کر دئے ہیں ان کے پیش نظر بہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ علوم شرعیہ کے فاضل تھے، اور قرآن مجید، حدیث شریف، فقہ، تصوف اور تاریخ اسلام کے جید عالم تھے

آپ کی زبان دکھنی ہے، سگل، انکو، اندھارا، تمنا، بھانا، ہیگا، ستی پو، نانوں، تمن، وغیرہ قدیم الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے، اکثر مقامات پر وزن کی خاطر متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر لیا ہے مثلاً کفر کی فے کو ترک کی رے کو، بعض جگہ تخفیف سے بھی کام لیا ہے جیسے احادیث کے بدلے احدیث وغیرہ۔ معدودے چند نظمیں فارسی میں بھی ہیں، مسدس، مخمس، ترجیع بند کے سوا اور کوئی صنف دکھائی نہیں دیتی البتہ فارسی میں دو چار قطعے کہے ہیں۔

میسور کے مسلم معاشرے میں جو برے رسم و رواج اور خلاف شرع امور پھیلے ہوئے تھے، درگاہی صاحبؒ نے اپنے کلام میں ان کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے آپ نے بڑے شد و مد سے ان کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ آپ کا مجموعہ کلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بڑی اچھی تفسیر ہے۔ اپنے کلام کے ذریعے آپ نے اصلاح اور تبلیغ کی ہمہ بالشان خدمت انجام دی، آپ کی حیثیت ایک معلم، مبلغ اور مصلح کی تھی، سب سے زیادہ مخالفت آپ نے ان پیروں، مرشدوں کی کی ہے جو مسلم سماج پر چھائے ہوئے تھے ان کی طریقت، شریعت سے بہت دور اور بے تعلق تھی، انہیں نہ شریعت کی کوئی خبر تھی نہ طریقت کا کوئی علم، نماز تک نہ پڑھتے تھے اور مریدوں سے من مانی کراتے تھے وہ کہتے تھے ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں، بعض اوقات مرید پیر کو سجدہ تک کر بیٹھتے تھے، ان کو اپنے حسب و نسب پر بڑا ناز تھا، درگاہی صاحبؒ نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ طریقت شریعت پر مبنی ہے جو شخص پابند شریعت نہیں وہ صاحب طریقت نہیں ہو سکتا، بے شرع آدمی منصور کی طرح انا الحق بھی کہے یا آسمان پر بھی اڑے وہ ہرگز صوفی نہیں

ہو سکتا، جو شخص علانیہ نماز چھوڑ دے وہ ولی نہیں ہو سکتا، سب سے بڑے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم ہیں، ان کے بعد صحابہ کرام علیہم السلام، شریعت اور طریقت کے بہترین عملی نمونے ہیں

محرم، صفر اور شعبان میں عجیب عجیب رسمیں رائج تھیں، درگاہی صاحب نے ان کی برائی کھول کر رکھ دی اور مسلمانوں کو قہر خداوندی اور عذاب اخروی سے ڈرایا، آپ کے کلام میں جابجا قرآن مجید اور حدیث شریف کے حوالے نظر آتے ہیں، مسجد اور نماز کی ضرورت اور افادیت پر آپ نے ہر جگہ زور دیا ہے، تین نظمیں تو مسجد کے متعلق ہیں، ایک میں مسجد کی ضرورت بیان کی ہے، دوسری میں مسجد کے فضائل بتاتے ہیں اور تیسری نظم میں آداب مسجد کی تعلیم دی ہے، چھ سات نظموں میں نماز کی تبلیغ کی ہے، بڑی تفصیل اور تاثیر کے ساتھ بتایا ہے کہ نماز اسلام کا رکن عظیم ہے، نمازی دارین میں سرخ رو ہوتا ہے اور بے نمازی کا انجام ہر جگہ برا ہوتا ہے

فجر کی نماز کے لئے اٹھنے کی تاکید ایک مسدس میں یوں کی ہے کہ مسلمانو! خدا کے فضل سے رات بخیر و عافیت گزر گئی، دیکھو موذن نماز کے لئے تمہیں بلا رہا ہے اٹھو، فرشتے نور کے طبق لئے تمہارے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں، چلو نماز پڑھ کر انہیں لے لو! ایک ترجیع بند میں دعوت عبادت اور دعوت ضیافت کا مقابلہ اور موازنہ بڑے پُر لطف انداز میں کیا ہے۔ اس کی ترجیع ہے،

فاسقاں دعوت عبادت سن کے ہوتے ہیں فرار
گرچہ ہے دعوت ضیافت دوڑ آتے بے شمار

ایک مسدس میں نمازِ جمعہ اور روزِ جمعہ کی فضیلت بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور ایک ترجیع بند کی ترجیع یہ ہے۔

کہے ہیں حدیثاں میں حضرت پیمبر　　کہ ہے بے نمازی سے تو خوک بہتر

ایک اور مسدس میں قصر نماز کی تاکید کی ہے اور اس کے مسائل رقم کئے ہیں دوسرے مسدسوں اور ترجیع بندوں کے موضوعات عموماً یہ ہیں

والدین کا ادب اور خدمت، وضو کی فضیلت، رمضان اور روزہ، تجہیز و تکفین، محرم اس کے فضائل و آداب، اہلسنت والجماعت کی حقانیت آباؤ اجداد کی غلط روی کی تقلید، سود خواری، زنا کاری، شراب، افیم، گانجا اور بھنگ، رقص اور موسیقی تلاوتِ قرآن، دنیا کی بے ثباتی، نسب نامہ رسولِ اکرم، آخری چہار شنبہ کی رسمیں، محرم کی بدعتیں اور کفریات، تقویٰ اور پابندئ شریعت، توحید ربانی وغیرہ ندرت مطالب کے لحاظ سے آپ کا کلام خالی نہیں، بعض مضامین تو بالکل انوکھے ہیں مثلاً حدیث موتوا قبل ان تموتوا کا مطلب آپ نے ایک ترجیع بند میں یہ بتایا ہے کہ اس سے پہلے کہ تم فطری موت مرو کافروں سے جہاد کرو اور مارے جاؤ شہادت کا مرتبہ پاؤ گے، وحدت وجود کے آپ سخت مخالف ہیں، کہتے ہیں کہ یہ غلط نظریہ ہے اور بالکل بے بنیاد، ایک مسدس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرتے ہیں۔

ڈاڑھی منڈھانے اور مونچھیں رکھنے کا ایک ترجیع بند میں یوں مذاق اڑاتے ہیں۔

ڈاڑھی منڈھا کر سربسر مونچھیاں رکھا ہے منہ اپر
جوں ناک گنڈی کا پر ہیں آدھا ادھر، آدھا ادھر

قرض کی مصیبتیں بھی ایک مسدس میں بیان کی ہیں، ایک مقام پر حسب نسب پر بڑائی کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے طاعت نسب بیکار ہے، آلِ رسولؐ وہی ہے جو قالِ رسولؐ پر چلے، رسولؐ نے خود اپنی نورِ نظر سے فرمایا کہ یاد رکھو تمہارے اعمال ہی تمہارے ساتھ آئیں گے، میرا رشتہ تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔ پھر کوئی عالم، مشائخ کا فرزند ہو یا غوث قطب کا فرزند، اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا،

ایک ترجیع بند قرآن مجید کی تعریف و توصیف میں کہا ہے۔ ایک مسدس میں تندرستی اور جوانی میں نیک عمل پر ابھارتے ہیں۔ فرعون کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بڑھاپے اور جان کنی کی توبہ اور نیک عمل اتنے قیمتی نہیں ہوتے، ایک اور ترجیع بند بہت پر لطف ہے جس میں بے شرع ملازمت اور غیر شرعی بیپار کی مذمت کی ہے، غیر شرعی نوکری وہ ہے جس میں شریعت کے اوامر ادا کرنے کا موقع نہ ملے اور نواہی سے پرہیز نہ کیا جاسکے اور غیر شرعی بیپار کہا ہے، ناپ تول میں کمی کرنے۔ پیاز کھانے اور نشہ آور چیزوں کا معاملہ کرنے کو

غرض حضرت درگاہی صاحب کے کلام میں عقائد، عبادات، معاملات معاشرت وغیرہ زندگی کے سب پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ہر ایک کی موجودہ خرابیوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور خدا اور رسولؐ خدا کے احکام کی روشنی میں اصلاح کی راہ بتائی گئی ہے تعلیم بھی ہے تنقید بھی، تہذیب بھی ہے اصلاح بھی مختصر یہ کہ نظم کے ذریعے آپ نے اسلام کی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے کی کوشش کی

عہد سلطنت خداداد میں مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کے گویا دو فرقے تھے، ایک علما کا اور دوسرا صوفیا کا، صوفیہ کا حال جو کچھ بھی تھا درگاہی صاحب کے کلام سے ظاہر ہے ہی، علما نے ہمیشہ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی شریعت کی راہ راست کی طرف رہنمائی کی، دونوں فرقوں میں نوک جھونک کا سلسلہ برابر جاری رہا، ٹیپو سلطان شہید خود عالم دین اور متشرع آدمی تھے اور صوفیہ سے زیادہ علما کے حامی رہے اور درگاہی صاحب نے تبلیغ احکام کی خدمت زور شور سے شروع کی تو مخالفوں نے جن کی تعداد زیادہ تھی اور اثر و رسوخ بھی زیادہ، حکومت سے کہہ کر ان کو شہر سے نکل جانے کا حکم دلا دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد بھی آپ کے ساتھ شہر سے نکل جانے پر کمربستہ ہوگئی، یہ دیکھ کر حکومت نے اپنا حکم واپس لے لیا اور دونوں میں کچھ مصالحت کرادی

حضرت درگاہی صاحب بذات خود متمول آدمی تھے، تجارت ان کا پیشہ تھا آپ کی اولاد آج بھی میسور میں آباد ہے

آپ کے نام سے جو مسجد موسوم ہے وہ میسور میں سب سے بڑا دینی مرکز رہی ہے، یہاں کی محفلیں، نمازیں، مواعظ اور تقریریں محتاج تعارف نہیں ۔

آخر میں حضرت درگاہی صاحب کے چند ابیات پیش کئے جاتے ہیں

بندگی کن تو کہ امروز ترا ہنگام است — شمع ایماں برافروز ترا ہنگام است

اے دلم عزم گناہاں نکنی بار دگر — توبہ کن تا کہ شب و روز ترا ہنگام است

اگر دین اسلام کامل ضرور است — برہ راست راہ شریعت چہ دور است

خلاف شریعت، طریقت، حقیقت — ولایت، کرامت ہمہ بس تصور است

جسے موت کا یاد ہر آن ہیگا — اسے زندگی کا نہ ارمان ہیگا

مومن مسلماں متقی جنت مقامی دیکھتا ۔ کافر منافق کو یقیں دوزخ مدامی دیکھنا

خدا دوستاں کو ہے درکار مسجد — شریعت، طریقت کا دربار مسجد

محمد بولے احدیث پیغمبر — بے نمازی سنتی سور بہتر

مسلمان مومن کو آسان مسجد ہاہے منکر منافق کو زندان مسجد

بے نمازی بے شرع کو دوست ہاپچانونکو گر اڑے اسمان پر تو اسکے نین مانونکو

تم پڑھو قرآن درود حسنین اوپر بار بار ہاہے گنہ رونا تمہیں سر پیٹ چھاتی مار مار

حق کہا مجہ کو پچھانو خالق و رزاق کر میں تمہارے رزق کا ضامن ہوا ہوں سربسر

کیا امیر و فقیہ و دولت مند ہوگئے ہاہیں زمین کے پیوند

کافراں سے جنگ کر مرنا اگے مرنا صحیح مو تو اقبل ان تموتو ابولے شہ سنا صحیح

عارف رستم آبادی اور انکی درسنی

رستم آباد جس کا اصلی نام سِرا ہے بنگلور سے شمال مغرب جانب پونا کی راہ میں پچھتر میل کے فاصلے پر واقع ہے، آج یہ شہر کھنڈروں اور خرابوں کی ایک تماشا گاہ ہے، لیکن آج سے دو سو برس قبل جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز تھا، عہد مغلیہ کی جامع مسجد، ملک ریحان کا مقبرہ اور عید گاہ صرف یہی تین عمارتیں صحیح و سالم کھڑی ہوئی ہیں، باقی متعدد مساجد اور مقابر ہیں جو منہدم ہو چکے ہیں، شہر میں اور شہر کے چاروں طرف میلوں تک قبریں ہی قبریں دکھائی دیتی ہیں جن میں سے اکثر ہموار ہو چکی ہیں، یہ مٹتے آثار اس شہر کی آبادی اور عظمت و رونق کا پتا دیتے ہیں، وہ عہد کس قدر عظیم الشان ہوگا جس کے کھنڈروں سے اتنی عظمت و شان ٹپکتی ہے۔ اس کی تاریخ اور اس کا تذکرہ تاریخ ہند کا گویا ایک گم شدہ ورق ہے۔ جس سے تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے عموماً چشم پوشی کی ہے، صرف میسور کے مشہور و معروف مورخ میر حسین علی کرمانی صاحب نشانِ حیدری نے اپنی دوسری تصنیف "تذکرۃ البلاد والحکام" میں ایک باب اس شہر کی تاریخ کے لئے وقف کیا ہے، لیکن ان کے بیان میں تاریخی رنگ سے زیادہ افسانویت ہے اور ان کی تصنیف اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے مخطوطہ نسخے بھی بہت کم یاب ہیں۔

مورخ سلطنت خداداد محمود بنگلوری مرحوم نے تاریخ جنوبی ہند

میں اس کا مختصر سا ذکر کیا ہے، لیکن اس سے بھی تشفی نہیں ہوتی، ولکس، رائس اور میسور گزیٹر کے مولف نے سرا کا مختصر سا ذکر کیا ہے اور وہ بھی اپنے اپنے رنگ میں، کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد شباب میں یہ شہر بڑا آباد اور بارونق تھا، پٹھانوں کی اکثریت تھی، پچاس ہزار گھر اور دو سو مسجدیں تھیں، علماء، فضلا اور صوفیہ بھی یہاں بڑی تعداد میں گزرے ہیں، شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کا بازار بھی گرم رہا ہے۔ سیاسی انقلابات اور جنگ و جدل کی مسلسل گرم بازاری نے جس طرح اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی اسی طرح یہاں کی علمی اور ادبی پیداوار کو بھی نیست و نابود کر دیا، صرف ایک صاحب قلم عارف کی پانچ مثنویاں رہ گئی ہیں، البتہ یہاں کے نقل شدہ چند مخطوطات ضرور دیکھنے میں آئے ہیں مثلاً لاہیجی کی گوہر مراد کا ایک نسخہ جو نہایت خوش خط سنہ ۱۱۰۰ھ میں قلعہ سرا میں نقل ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان شہیدؒ نے قلعہ بنگلور قلعہ سرا کے نمونے پر اور بنگلور اور سری رنگ پٹن کے محلات سرا کے محلات کے نمونے پر بنائے تھے۔

کرمانی نے تذکرۃ البلاد والحکام میں لکھا ہے کہ پہلے اس جگہ گھنا جنگل تھا، سلطنت بیجانگر کا ایک سردار شکار کھیلتے ہوئے ادھر آنکلا۔ ایک لومڑی اپنے بھٹ سے نکلی تو اس نے اپنے شکاری کتے اس پر چھوڑ دیے لیکن لومڑی نے ڈٹ کر ایسا مقابلہ کیا کہ شکاری کتے دم دبا کر بھاگ گئے، سردار اس واقعے سے بہت متاثر ہوا کہ یہاں کے جانور اتنے نڈر اور بہادر ہوتے ہیں۔ اس نے مرکز سے اجازت لے کر یہاں اس قلعے کی بنا ڈالی جو آج بھی موجود ہے اور اس کے بیٹے نے اسے تکمیل پر پہنچایا، انہوں نے شہر بھی بسایا، چند ہی سال بعد محمد

عادل شاہ کے عہدِ سلطنت میں رن دولہ خاں نے اسے ۱۶۳۸ء میں فتح کر لیا اور یہ قلعہ اور اس کے اطراف واکناف کا علاقہ سلطنتِ بیجا پور میں شامل ہو گیا، یہاں صوبہ داری قائم ہو گئی اور اس علاقے کو صوبہ سرا کے نام سے موسوم کیا گیا ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے اسے بیجا پور کرناٹک بالا گھاٹ کا مرکز بنا دیا۔ مغل گورنر یا صوبہ دار یہاں رہتا تھا اور یہیں سے اس سارے علاقے کا انتظام کرتا تھا ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں نے سرا پر قبضہ کر لیا، بسالت جنگ کے ایما پر حیدر علی خاں نے ۱۷۶۱ء میں اسے مرہٹوں کے قبضے سے نجات دلائی تو بسالت جنگ کی سفارش پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے آپ کو نواب بہادر کا خطاب اور سرا کی صوبہ داری کا فرمان ملا، گویا آپ سرا کے آخری مغل گورنر تھے، اس کے چند ہی دن بعد آپ نے میسور میں سلطنتِ خداداد کی بنا ڈالی اور سرا کا علاقہ اسی میں شامل ہو گیا اور اس نئی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا، ۱۷۶۶ء میں پھر مرہٹے اس پر قابض ہو گئے اور ۱۷۷۴ء میں ٹیپو سلطان نے ان کو مار بھگایا اور ایسی شکست دی کہ وہ پھر اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہ کر سکے، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنتِ خداداد کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ اس شہر کی تباہی اور ویرانی کا بھی آغاز ہو گیا

ظاہر ہے کہ ایک سو ساٹھ سال تک یہ شہر جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک اہم مرکز رہا، عادل شاہی، مغلیہ اور خداداد ی تینوں دوروں میں اسے ایک صوبے کی حیثیت حاصل رہی، بیجا پور کو زوال آنے لگا تو مسلمان ہجرت کر کے یہاں آئے، مغلیہ دور کی افراتفری نے انتشار پھیلایا تو یہاں سے بھی ہجرت کی اور جنوب کے دوسرے مقامات میں پھیل گئے جیسے تلمنگل، ہسکوٹہ بڑا بالا پور، سری رنگ پٹن، کولار وغیرہ، حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان شہیدؒ

نے اپنی فوجوں کے لئے یہاں سے ہزاروں کی تعداد میں سپاہی بھرتی کئے،
مسلمانوں کے علوم و فنون اور دکھنی ادب بیجاپور سے نکلے تو اسی راہ سے
ہوتے ہوئے ریاستِ میسور کے مختلف مقامات میں پھیلے۔ بہر طور جنوبی ہند
کے اسلامی دور کی تاریخ میں اس مقام کا ایک اہم حصہ رہا ہے اور اس کی
ثقافتی خدمات مورخوں اور محققوں کی توجہ کی مستحق ہیں

مقامی روایت ہے کہ قلعے کے تین دروازے تھے یا یہ قلعہ
تراہے پر واقع تھا، اسی بنا پر اسے سہ راہ کہا گیا جو بگڑتے بگڑتے سرا بن گیا
دورِ مغلیہ میں رستم جنگ صوبہ دار مامور ہوا تو اس نے اس کا نام رستم آباد رکھا
ٹیپو سلطان شہیدؒ نے جہاں اور مقامات کے نام بدل دئے وہاں اسی نام
کو برقرار رکھا

عارف اسی شہر سرا یا رستم آباد کے متوطن تھے، حقوق المسلمین
کو آپ نے ۱۲۲۲ھ میں تکمیل پر پہنچایا، اس وقت اپنی عمر پچاس سال کی بتائی
ہے تو اس حساب سے آپ کا سال ولادت ۱۱۷۲ھ ہے یہ وہ زمانہ تھا جب
سرا پہ مرہٹوں کا قبضہ تھا، چند سال بعد حیدر علی خاں کی نوابی قائم ہوگئی، چنانچہ
حیدر علی خاں کے عہد حکومت میں آپ پروان چڑھے، آپ کے آباؤ اجداد بیجاپوری
تھے، چنانچہ خود حقوق المسلمین کے نثری دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں :-

بعد حمد پروردگار و نعت سید ابرار و مناقب آل اطہار و مدائح
اصحاب کبار کے جو بے حد و بے شمار ہے۔ عارف بے معارف عاصی خاکسار و
ذرہ بے مقدار ابن سید محمد ابن سید حافظ ابن سید بدرالدین ابن سید ہدیہ
حسینی القادری بیجاپوری و ساکن رستم آباد عرف سرا عفو کرے حق تعالیٰ گناہاں
اس کے اور خیر کرے خاتمہ اوس کا بیچ خدمت بزرگان حق شناس و پاکیاران

حقیقت اسلام کے عرض کرتا ہے یہ فقیر دیکھا کہ بہت مرداں ہور عورتاں اپنے حق داروں کی حق شناسی سے بے علمی کے سبب غافل اور جاہل ہیں جیسا کہ.....

ہور موناں حقوق مسلماناں سے بالکل خبر نہیں رکھتے اور عبادت و مضامین کتب فارسی کی پچھانت سے عاجز و قاصر ہیں اس واسطے یہ فقیر اس تمام حقوقاں کو بعض معتبر کتاباں سے نکال کر نظم ہندی میں جمع کرنے چاہتا تھا لیکن سستی سے مزاج کے اور کم فرصتی سے وقت کے یہ بات بیچ وجود کے نیں آسکتی تھی دوست شفیق ہور یار رفیق غلام علی شریف زاد اللہ قدرہ و شرح صدرہ باعث و پر بجد ہو کر اس بات پر لائے اور فقیر اُس کو تھوڑی مدت میں جمع کیا تاکہ اپنے کو حسنات اور موناں کو قدرت حقوق کے معصیت سے نجات ہووے.... اس جمع کرنے کے ثواب کے نیں میرے والدین کے ارواح مطہرہ میں تحفہ کیا اور نام اس کتاب کا حقوق المسلمین رکھا کس واسطے کہ اس میں تمام حقاں مسلماناں کے ہیں ہور تاریخ ختم و تعداد ابیات جو جملہ پانچ ہزار بیات سو چار ہیں درج کیا ہوں ہور نثر سے اس کتاب کی فہرست لکھنے میں یہی مراد ہے کہ جب کتاباں سے میں جمع کیا ہوں اور روایات و نقل وحکایات اوٹھایا ہوں سو اوس کتاباں نظم میں نہیں آسکتے تھے اور ان کتاباں کا نام نا آنے سے اعتبار اس کتاب کا کم ہوتا ہے اس واسطے یہ تھوڑے سطراں نثر سے لکھیا۔

آپ کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی پانچ مثنیوں کے مخطوطے جو جامعہ میسور کی مخطوطہ لائبریری میں محفوظ ہیں اور جن کے نسخے ہندوپاک کی اور مخطوطہ لائبریریوں میں بھی موجود ہیں ان سے آپکی شخصیت اور حیات کے بعض حالات پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علوم شرعیہ کے جید عالم، صحیح معنوں میں عارف اور قادر الکلام شاعر تھے

پانچوں مثنویاں دینی موضوعات پر لکھی ہیں، کہیں کسی بادشاہ یا امیر کا کوئی ذکر تک نہیں کیا، تعریف کی ہے تو بس اپنے پیر و مرشد کی۔ اپنے ان دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے جو آپ کی تصانیف کے محرک ہوئے، ان مثنویوں کے علاوہ ایک درسی اور ایک مخمس مدح غوث اعظم بھی لکھا ہے جو ہماری مخطوطہ لائبریری میں موجود ہیں ان سب کے علاوہ تلنگی کے عظیم المرتبت قصیدہ گو شاعر محمد علی خانہ زاد تخلص کے دیوان قصائد اردو "گنج شائگاں" کا قطعہ تاریخ آپ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ یہ قطعہ فارسی میں ہے یہ دیوان ۱۲۲۱ھ میں پورا ہوا تھا، خانہ زاد نے اپنے ہاتھ سے یہ قطعہ یوں لکھا ہے۔

"ایں قطعہ تاریخ از نتائج طبع وقاد عارف پر معارف کاشف بدائع عارف شاہ صاحب"

حقوق المسلمین کے نثری دیباچے میں عارف نے خود کو عارف بے معارف لکھا ہے اور یہاں آپ کے معاصر خانہ زاد نے آپ کو عارف پر معارف کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصرین آپ کو کتنی عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، محمد علی مہکری آصف خانہ زاد آپ کے معاصر تھے تلنگل بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ فارسی اور اردو کے بڑے بلند مرتبہ اور قادر الکلام قصیدہ گو شاعر تھے آپ کے اردو قصائد کا مجموعہ "گنج شایگاں" اور فارسی قصائد کا مجموعہ "بکر دکان" خود آپ کے قلم سے لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے۔ اردو دیوان میں تین ہزار سے زیادہ اور فارسی دیوان میں چھ ہزار کے لگ بھگ شعر موجود ہیں لیکن یہ تمام قصائد بزرگان دین کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی قصیدہ گوئی پر ایک تعارفی مضمون آئندہ ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔

عارف شاہ صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے جو قدیم ریاست بھور

کے اولین اردو مصنف قرار دئے جاتے ہیں اور جن کا ایک رسالہ مرآۃ الاسرار عبدالقادر سروری نے میسور کے دورانِ قیام میں شائع کیا تھا، عارف کو ان سے والہانہ عقیدت تھی، اپنی دو مثنویوں کے آغاز میں ان کی بہت تعریف و توصیف کرتے ہیں، حقوق المسلمین میں لکھتے ہیں

شاہ صدرالدین پیر بے نظیر ؞ واقف سر بطوں روشن ضمیر
غوث کے دربار میں تھا باادب ؞ چشت سے پونچیا تھا اسرار ادب

مطلوب المریدین کے آغاز میں لکھا ہے

مرا جو پیر تھا شیخ مجد ؞ جسے تھا نام صدرالدین محمد
انتھا اوس وقت کے شیخاں میں کامل ؞ نہ اوس سا دوسرا تھا صاحبِ دل

حضرت شاہ صدرالدینؒ چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے اور امین الدین اعلیٰ کے سلسلہ ارادت میں منسلک تھے، آپ کا مزار شریف ململ میں واقع ہے، یہ مقام بنگلور سے پچیس میل کے فاصلے پر سرا کے راستے میں آباد ہے۔ آپ سید عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی جیلی کے ایک صاحب زادے تھے جن کا مزار شریف ارکاٹ سے چھ میل کے فاصلے پر باوا آدم کی پہاڑی پر واقع ہے جس کی بگڑی ہوئی شکل بادم کی پہاڑی زبان زد خاص و عام ہے، ہندو اس مقام کو پنچ پانڈو ملائی کہتے ہیں، یہاں اسی زمانے کی دو مسجدیں ہیں اور آپ کی اولاد و احفاد آباد ہے جو وسیع اوقاف کی نگرانی کرتے ہیں، یہ مقام مشہور زیارت گاہ ہے اور ہر برس زائرین دور دور سے آتے رہتے ہیں۔ میں خود بھی زیارت کے لئے گیا تھا تو وہاں یہ روایت سنی کہ حضرت موصوف مدنی تھے، خواب میں حکم ہوا تو ارکاٹ آئے اور ٹیپو مستان ر، ؛ سے ملے، یہ وہی ٹیپو مستان ہیں جن کی د ــــ ٹیپو سلطان کی ولادت مروی ہے اور جن کے نام پر حیدر علیخاں نے ان کا نام رکھا، ٹیپو مستان نے شاہ میراں کو بادام؛

کی پہاڑی پر پہنچایا جہاں قیام کرنے کا حکم ہوا تھا، شاہ میراں کا ایک مختصر سا دکھنی رسالہ سبعہ صفات ہماری مخطوطہ لائبریری میں محفوظ ہے،

عارف کے والد نے جو خود بھی عالم فاضل تھے نلمنگل میں آپ کو لڑکپن ہی میں حضرت شاہ صدرالدین کے حوالے کر دیا، آپ نے ان کی تعلیم و تربیت فرمائی اور انہیں کے زیر سایہ آپ پروان چڑھے عمر بھر ان کے ساتھ رہے، ان کی وفات کے بعد نلمنگل ہی میں مقیم رہے اور وہیں وفات پائی، میں نے نلمنگل میں دونوں بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کی، عارف کا مزار آثار شریف کی عمارت کے احاطے میں واقع ہے، زیارت سے بڑا سکون اور روحانی فرحت حاصل ہوتی ہے اسی احاطے میں درگاہ شریف کے سجادہ نشین سید شاہ محی الدین قادری بھی مقیم ہیں جو عارف کے پڑپوتے کے فرزند ہیں، انہوں نے بتایا کہ عارف ایک سو پینتیس کتابوں اور رسالوں کے مصنف تھے، ان کی فہرست اور ان کے مخطوطہ نسخے ان کے پاس موجود تھے، لوگ عاریتاً لے گئے اور فہرست تک نہ لوٹائی ایک مختصر سی نظم جو ان کو یاد تھی میں نے نقل کر لی، وہ یہ ہے

سر گناہوں کو یاد رو یا کر	آنکھ کو آنسوؤں سے دھویا کر
جانور ذکر حق میں ہیں مشغول	صبح کے وقت تو نہ سو یا کر
جان دنیا کو آخرت کا کھیت	بیج نیکی کے خوب بو یا کر
صرف اوقات کر عبادت میں	عمر کو مفت میں نہ کھو یا کر
خشک مغزی کو تیری غفلت کی	روغن یاد حق بھگو یا کر
عارفؔا اس کی کذب و غیبت میں	تو زباں کو نہ اپنی گو یا کر

دو رسالوں کے نام جو آپ کو یاد تھے یہ بتائے، دلیل العابدین اور کشف الربوٗ

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ اور خانہ زاد دونوں عہد سلطنت خدا داد کے شاعر ہیں، لیکن اپنے کلام میں کہیں ٹیپو سلطان شہید کا کوئی ذکر اشارتاً یا کنایتاً بھی نہیں کرتے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ محمود بنگلوری نے۔ تاریخ سلطنتِ خدا داد میں لکھا ہے کہ مصنف کتاب نے سنا ہے کہ بلمنگل کا نام مفسد آباد رکھا گیا تھا کیوں کہ وہاں سرکشی کے آثار موجود تھے" واللہ اعلم" یہ امر تحقیق طلب ہے اور اس کا ثبوت کسی تاریخ سے تو نہیں ملتا۔ عارف کی مثنویوں کا مختصر سا تعارف ہدیۂ ناظرین ہے:۔

۱۔ **عقائد نامہ ہندی** ۔ ۱۲۱۴ھ میں لکھی گئی اور عارف کی اولین مثنوی معلوم ہوتی ہے، ایک سو پچاسی ابیات پر مشتمل ہے جن میں اسلامی عقائد کا بیان بڑے دل نشین انداز میں کیا گیا ہے، عارف اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں اور سال ختم اور تعداد ابیات بھی نظم کرتے ہیں، چند ابیات ملاحظہ ہوں۔

خدا کا حمد اور نعتِ پیمبرؐ
زیادہ تر ہے اندازِ بیاں سوں

مناقب چار اصحابانِ اطہر
ادا کیوں ہو سکے میری زباں سوں

یہاں دم مارنے میں مجھ کہ یارا
خموشی بن نہیں وستا ہے چارا

لکھوں اب مختصر ہندی عبارت
عقائد نامۂ سنت جماعت

اگر ہے اس منے کچھ سقم و سستی
تمہارے سے ہے امید درستی

۲۔ **حقوق المسلمین** ۔ آپ کی سب سے طویل مثنوی ہے جس کے ابیات کی تعداد پانچ ہزار سات سو چار ہے اور جس کا اختتام ۱۲۲۲ھ میں ہوا، یہاں بھی عارف اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں اور سبب تصنیف سال تکمیل اور تعداد ابیات وغیرہ تفصیل سے نظم کرتے ہیں۔ یہ مثنوی آپ کا شاہکار ہے، اس میں بڑے دل نشین اور موثر انداز میں مسلمانوں کے حقوق و فرائض کا تفصیلی بیان کیا ہے

جا بجا قرآنی آیات، احادیث شریفہ، اقوالِ بزرگاں، روایات و حکایات وغیرہ سے کام لیا ہے، مسلمانوں کے لئے یہ ایسی مفید کتاب ہے کہ اگر اس کو جدید اردو نثر میں منتقل کر لیا جائے تو ہر مسلمان اس کی رہ نمائی میں منزلِ مقصود کو پہنچ سکتا ہے، اس مثنوی کو بڑا قبولِ عام نصیب ہوا چنانچہ اس کے نسخے جنوبی ہند میں جا بجا ملتے ہیں، اس کے مزید پانچ ابیات جو مدح مرشد میں کہے گئے ہیں، ملاحظہ ہوں:۔

فیض سے اوس کے تونگر ہور فقیر	نعمت دارین سے تھے بہرہ گیر
تھا تصوف میں اوسے لمبی دست گاہ	محو یادِ حق میں تھا شام و پگاہ
مے سے وحدت کی سدا سرشار تھا	شاہدِ معنی سے دائم یار تھا
رکھ طریقِ شرع پر ثابت قدم	مارتا تھا بھی طریقت بیچ دم
رحمت رضواں ہو اوس کی روح پر	پر کرے حق نور سے اس کی قبر

اس کا دیباچہ نثر میں ہے جس کا اقتباس اس سے پہلے پیش کیا جا چکا ہے

۳ - **مطلوب المریدین**۔ ۱۲۳۰ھ کی تصنیف ہے اور دو ہزار دو سو ستائیس ابیات پر مشتمل ہے، اس مثنوی میں پیر و مرشد سے ارادت کے آداب پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں بھی عارف اپنی زبان کو ہندی ہی کہتے ہیں، آغاز میں نعتِ شریف بڑی عقیدت سے کہی ہے جس کے چند ابیات پیش کئے جاتے ہیں۔

محمدؐ مظہرِ ذاتِ خدا ہے	خدا میں بن خدا سے نیں جدا ہے
محمدؐ شاہ خیل انبیا ہے	محمدؐ تاج فرق اصفیا ہے
محمدؐ رحمت اللعالمیں ہے	محمدؐ پچ شفیع المذنبیں ہے
محمدؐ باعثِ ایجاد عالم	وجود آدم و اولاد آدم
خدا چاہا کرے جب خلق پیدا	کیا ہے ذات سے اوس کی ہویدا

جہاں لگ ہاہے بلندی ہور پستی
اوسی کے نور سے پاتے ہیں ہستی

اوسی کے فیض سے سب جسم وجاں ہاہے
اوسی کے فیض سے کون ومکاں ہاہے

اوسے نوں بوجھ بیشک حق کا سایا
جو کوئی پایا اوسے او حق کو پایا

کسے طاقت ہے تا وہ موں کو کھولے
نبی کی نعت میں کچھ بات بولے

ہاہے اوس کا مرتبہ تعریف ستی بہار
نکو صلوٰت بن کچھ بول زنہار

بھی اوس کے آل اور اصحاب پر سب
درووداں ہور سلاماں بھیج نواب

۴ - مولود النبیؐ یا میلاد نامہ - یہ چھوٹی سی مثنوی ہاہے جس میں میلاد شریف کا بیان کیا گیا ہاہے، سال تصنیف معلوم نہیں ہوتا، چند ابیات پیش کئے جاتے ہیں -

حمد ہاہے اوس ذات کو جو ہاہے قدیم وبقا
نور جلال وجمال غیب سے ظاہر کیا

جب تھا اپ بے خبر اپنے سے اور غیر سے
نیں تھا ظہور صفات کچھ نہ تھا اوس کے سوا

وحدت مطلق کے بیچ شاہد ذات احد
اپنے کو مشہود پا بولا ہاہے انّی انا

گنج خفی سے نکل عشق کیا جلوہ گر
حلت عرفاں میں خود متجلی ہوا

فرش کیا اک بسیط اوس کیلئے سبز گاہ
حکم کیا سجدہ کر رب کے تئیں اپنے سدا

امر سے کن کے ہوئے حور وملک جن وانس
لوح وقلم کرسی وعرش سب ارض وسما

۵ - وفات نامہ - یہ تین سو ستر ابیات پر مشتمل مثنوی ہاہے اور اس کا سال تصنیف مذکور نہیں، اس میں حضور صلعم کے وصال کا بیان ہے - چند ابیات ملاحظہ ہوں -

رحمۃ للعالمین خطاب اوس کا
شافع المذنبین جناب اوس کا

دین اوس کا ہاہے ناسخ الادیان
شرع اوس کی ہاہے زیورِ ایماں

مخمس مدح غوث اعظمؒ، درسنی نامہ منظوم اور قطعۂ تاریخ گنجِ

شاگان جو فارسی میں ہے ان پانچوں مثنویوں کے علاوہ ہیں اور ان میں سے
درستی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ امر قابل غور ہے کہ ایسے عام دین صوفی
شاعر کے قلم سے ایک نظم ایسی بھی نکلی ہے جس کی اس سے کوئی توقع نہیں ہو سکتی
یہ دراصل بیجاپوری مکتب شاعری کا رنگ ہے جو اس نظم میں ظاہر ہے
یوں دیکھا جائے تو آپ کی صوفیانہ اور دینی شاعری اور آپ کے پیر و مرشد
کی نثر و نظم کا تعلق بھی بیجاپوری مکتب ہی سے ہے، بلکہ قدیم ریاست میسور کی
دکھنی ادب کو اسی مکتب کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے، بیجاپور میں آٹھویں
عادل شاہی سلطان علی عادل شاہ ثانی۔ شاہی تخلص نے شاعری کا جو بازار گرم
کیا تھا اس کا اثر اس کے بعد مدتوں تک اس خطے میں جاری رہا، اس کی
برہنی کی تقلید میں اور شعراء نے بھی برہنیاں لکھیں، چنانچہ لگ بھگ سوا سو
برس بعد سرا کے اس شاعر عارف نے بھی اسی موضوع پر اور اسی رنگ میں
درستی کہی، یہ دکھنی میں ریختی کا ایک نمونہ ہے جو ہندی شاعری کے
زیر اثر دکھنی ادب میں پیدا ہوئی۔ برہنی کی طرح اس درستی میں بھی
ایک فراق کی ماری عورت اپنے جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمانی کرتی
ہے، اس کی بھی وہی چھوٹی بحر ہے جو شاہی کی برہنی کی ردانی
دیدنی ہے، قافیئے بڑی بے تکلفی سے لائے گئے ہیں اور شیرینی اور حلاوت
کوٹ کوٹ کر بھری ہے، کوئی بات معیار اخلاق سے گرنے نہیں پاتی،
تہذیب و شرافت کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، بیان خوش مذاقی کی
حد سے بڑھنے نہیں پاتا، ابتذال اور گراوٹ نام کو نہیں، شاہی کی برہنی
اور چیز ہے، عارف کی درستی اس کی ٹکر تو نہیں لے سکتی، البتہ اس کی
نقل و تقلید میں پوری طرح کامیاب ہے۔ دو چار مصرعے دونوں نظموں

ہیں ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں، خیالات تو عموماً وہی ہیں، ہندی کے سبک اور ہلکے پھلکے الفاظ عارف کی درسنی میں بھی نگینے کی طرح بٹھائے گئے ہیں۔ زبان دکھنی ہے لیکن اتنی پرانی نہیں جتنی شاہی کی برہنی کی ہے، دکھنی زبان اور قواعد کی خصوصیات درسنی میں بھی موجود ہیں، جن کا بیان تحصیل حاصل سے زیادہ نہ ہوگا، لیکن شاہی کی برہنی میں معشوق ابتدا سے آخر تک مادی ہے اور عارف کی درسنی میں خلط مبحث ہوگیا ہے، عام طور پر معشوق کے مادی اوصاف ہی گنائے گئے ہیں اور اظہار عشق عورت کی طرف سے ہورہا ہے مگر دسویں بند میں معشوق حقیقی مراد ہے جہاں کہتے ہیں" وہ سب کا پالن ہار ہے" آخری دو بندوں میں بھی یہی رنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر ایک متشرع صوفی ہے۔ جس رنگ میں بھی کہے گا آخر وہی بات کہے گا اور اسی محور پر گھومے گا۔ درسنی ہدیۂ ناظرین ہے:۔

درسنی

نیں وِسنا کاں ہے لال مِرا ؛ نا بولوں اوس سے حال مرا

کئی دن سوں پیتم آیا نیں
منجہ سر پہ سایا بچایا نیں
کچھ بات میٹھی سنوایا نیں
منجہ بچھڑی کو منوایا نیں
دل میرے کو ہنسلایا نیں
نیں وسنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جس دن سے او مستور ہوا
ہور بر سے میرے دور ہوا
اس غم سے سینہ پور ہوا
پھٹ دل کا شیشہ چور ہوا
یہ تن من جل تندور ہوا
نیں وسنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سکھ چھوڑ مرے نیں نھاٹیا ہے
دکھ سینے ہیں آ ڈاٹیا ہے
ہور آرا دل کو کاٹیا ہے
سر بانٹیاں مجکو باٹیا ہے
تن پیراہن نیوں پھاٹیا ہے
نیں دستا ......

نا شب کو یک پل سوتی ہوں
دن کس محنت سے کھوتی ہوں
ہیں نس دن بیٹھی روتی ہوں
انکھ پانی سے منہ دھوتی ہوں
دو آنکھیاں رہ سے جوتی ہوں
نیں دستا ......

گر آوے دن یا رین منے
نت راکھوں سکھ اور چین منے
دو ابرو کے قوسین منے
لے بیٹھوں اپنے نین منے
جوں پتلی دو عینین منے
نیں دستا ......

پیو میرے سے جب بات کیا
دل میرے کو تب مات کیا
ہیں مجکو اپنے سات کیا
اس دن کو مجہ پہ رات کیا
اب مجہ پہ کیسا گھات کیا
نیں دستا ....

ٹک مجہ سے آ کر مل رے پیا
تجہ بن بیکل ہے دل رے پیا
نیں کل میرے تنیں تل رے پیا
ہے سینے پہ جوں سل رے پیا
یے مجہ پہ ہے مشکل رے پیا
نیں دستا ....

ہیں نیہہ کی آتش پھوکی ہوں
تجہ دیکھ ہیں جھک جھک سوکی ہوں
تجہ خدمت ہیں نیں چوکی ہوں
تجہ درشن کی نت بھوکی ہوں
نیں کہہ سکتی کچھ موکی ہوں
نیں دستا ....

جب دل سے دل کو رستا ہے
تب دل جا دل میں پھنستا ہے
گر آنکھاں کو نیں دستا ہے
بن دلبر دل میں بستا ہے
کیا بات دیکھو شا ہنستا ہے
نیں دستا ....

وہ پیا مرا جگ پیارا ہے
وہ سب کا پالن ہارا ہے
نیں اوس بن مجکو چارا ہے
آملنا اوس کا نیارا ہے
اوس ملنے کس کو نیارا ہے
نیں دستا ....

گر آوے پیارا پیار کروں
اس تن من کو بلہار کروں
بل گل کا اپنے ہار کروں
دکھ ہجرت کا اظہار کروں
رو دامن کو گلزار کروں
نیں دستا ....

جو عاشق ہے سو پاوے گا
نت مشکو اوس سے لاوے گا
تب اوس کو کلبہ دکھلاوے گا
جو غفلت میں رہ جاوے گا
بڑ حسرت میں پچھتاوے گا
نیں دستا ....

میں باندی جی کا ہوڑ سجن
بیو میرے نین مت چھوڑ سجن
دل میرے کو مت توڑ سجن
اس شیشے کو مت پھوڑ سجن
پھر پھوٹے کے نیں جوڑ سجن
نیں دستا ....

ہوں عارف بن عرفان نہیں
ہوں عاشق بن اوسان نہیں
جوں تن ہے اوس بن جان نہیں
جیوں سوتا ہے سدیان نہیں
یہ مشکل ہے آسان نہیں
نیں دستا ....

سیر شریف

یہ ریاستِ میسور میں لکھی ہوئی اردو کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مشہور اور مقبول کتاب ہے جس کا اصل نام "جنان السیر" ہے عرفِ عام میں اسے سیر شریف کہتے ہیں، اس گراں مایہ تصنیف پر ریاستِ میسور جتنا ناز کرے کم ہوگا۔ قبولِ عام، قدر ومنزلت، کثرتِ اشاعت اور ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اس کا شمار اردو کی اہم ترین تصانیف میں ہونا چاہیے۔ ریاستِ میسور کے مسلمانوں میں قرآنِ مجید کے بعد اسی کتاب کا سب سے زیادہ استعمال رہا ہے، گھروں میں عورتیں روزانہ بڑے ادب اور اہتمام سے پڑھتی ہیں، مسجدوں میں مرد ہر سال اس کا ختم کرتے ہیں۔ جہیز میں قرآنِ شریف کے ساتھ یہ بھی شامل رہتی ہے، سارے جنوبی ہندستان میں اس کی عام مقبولیت کا کم وبیش یہی حال ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے دوسرے تمام علاقوں میں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ مزید برآں مدتوں تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم ہندستانی مسلمانوں میں بھی اس کا عام استعمال رہا ہے، کثرتِ اشاعت کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ایک سو سال سے لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوکر فروخت ہوئی ہے، ہر سال دو ایک مرتبہ دو چار مطبعوں میں دس بیس ہزار کی تعداد میں چھپتی رہی ہے، پھر بھی نہ مانگ میں کمی آئی نہ رفتارِ اشاعت میں سستی، اس کا بازار ہمیشہ گرم رہا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جب تک اردو بولنے والے مسلمان باقی رہیں گے جنان السیر کے چمنوں میں کبھی خزاں نہ آنے پائے گی، اردو کی چند ہی کتابیں ہو سکتی ہیں جن کی کثرتِ اشاعت کا یہ حال ہوگا۔ ان میں بھی اس کتاب کو ہر طرح سب پر فوقیت حاصل ہے، اس لحاظ سے

کم سے کم اسے اردو کی سب سے بڑی کتاب کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے مصنف بھی اتنے ہی مشہور اور معروف ہیں۔ جتنی یہ کتاب خود ہے آپ کا اسم گرامی شاہ عبدالحیؒ بنگلوری تھا، احقرؔ تخلص کرتے تھے، آپ نے خود اس کتاب میں اپنا سالِ ولادت ۱۲۳۲ ہجری بتایا ہے۔ تعلیم ویلور کے مدرسۂ لطیفیہ میں حاصل کی، وہاں آپ نے عنفوانِ شباب میں درس نظامیہ کی تکمیل کرلی۔ یہ جنوبی ہند کا بڑا عظیم الشان مدرسہ ہے جس کی فیض رسانی کے نقش کو زمانہ کبھی مٹا نہ سکے گا۔ اس کے مہتمم اور صدر مدرس قطب ویلور سید محی شاہ محی الدین عبداللطیف ذوقیؒ تھے، آپ سے شاہ عبدالحی نے پورا پورا فیض اٹھایا اور علم وفن میں وہ دست گاہ پیدا کرلی کہ ایسے متبحر علماء اس علاقے میں شاذ و نادر ہی گذرے ہوں گے۔ قطبِ ویلور کو اپنے دو شاگردوں پر بڑا ناز تھا، ایک شاہ عبدالحی دوسرے محی الدین دونوں طریقت میں آپ کے مرید تھے اور دونوں کو آپ نے قادریہ سلسلے کی خلافت دی تھی، اور دونوں کو آپ نے فراغتِ تعلیم کے بعد مدرسے میں مدرس مامور کرلیا تھا۔ محی الدین نے توہیں عمر بسر کردی، آج بھی جنوبی ہند میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ لیکن شاہ عبدالحی بنگلور آگئے اور یہاں وعظ و تدریس اور وعظ کرنے لگے، لگ بھگ پچاس برس باقاعدہ درس دیتے رہے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری کرلیا۔ کہتے ہیں کہ آپ کثرت سے وعظ کرتے تھے اسی لئے آپ کو واعظ عبدالحی کہا جاتا ہے، وعظ میں خطابت کا رنگ ہوتا تھا۔ معلومات کا دریا بہا دیتے تھے، اتنی تاثیر ہوتی تھی کہ گناہ گار تائب اور پتھر دل موم ہو جاتے تھے، حاضرین محفل سے ہدایت و توفیق کا عطیہ لے کر اٹھتے تھے اور اکثر محفلوں میں دو ایک کافر آپ کے دست مبارک پر مسلمان ہو جاتے تھے۔ آپ کے فرزندوں نے بھی آپ کے خانگی مدرسے ہی میں تحصیل علم کی، بڑے فرزند عبدالقادر صوفی بڑے پایہ کے عالم اور صوفی ہوئے اور والد ماجد کے زیر سایہ ہی تصنیف و تالیف اور وعظ و تدریس میں لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ بنگلور سے قریب ہی کسی قصبہ میں عشرہ محرم کی محفلوں میں وعظ کرنے

کو شاہ عبدالحی کو مدعو کیا گیا تھا، وہاں کی ایک جماعت تعزیہ داری پر مصر تھی، دوسری اس کی مخالفت کرتی تھی، اس نے تعزیہ داری کے بدلے شاہ صاحب کے مواعظِ حسنہ کا انتظام کیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جماعتوں میں تصادم ہو گیا۔ شاہ صاحب کو بھی جہلا نے زد و کوب کر دیا۔ راتوں رات آپ کو جھٹکڑے پر بنگلور پہنچا یا گیا اور چھ مہینے زیرِ علاج رہنا پڑا، یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۹ھ میں پیش آیا۔

آپ کے مرشد طریقت اور استاد قطب ویلور کا وصال ۱۸۸۲ء میں مدینہ منورہ میں ہوا تھا، اسی زمانے میں آپ کے دل میں بھی حج و زیارت کی دھن سمائی تھی، اور یہ تمنا مضطرب کر رہی تھی کہ مرشد و استاد کی طرح آپ کو بھی مدینہ منورہ کی خاک پاک نصیب ہو گویا اسی انتظار میں جیتے رہے، اس واقعے نے اس اشتیاق کو خوب بڑھا دیا، ہمت کر کے آپ بنگلور سے عازم بمبئی ہوئے اور وہاں سامانِ سفر درست کرنے لگے۔ کسی مطبع میں عربی کتابوں کی تصحیح پر مامور رہے، جب زاد راہ کی صورت نکل آئی تو عرب تشریف لے گئے، مکہ معظمہ پہنچے، حج کے بعد زیارت سے مشرف ہوئے، پھر مکہ معظمہ کے ایک مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ مقاماتِ مقدسہ میں بہت جلد آپ کے علم و فضل کا چرچا ہو گیا، کچھ ہی دن بعد علماء حرم نبوی آپ کو مکے سے مدینے لے گئے اور حاکم مدینہ نے آپ کو حرم نبوی کا امام مامور کر دیا، چنانچہ ڈھائی تین برس آپ نے اس مبارک مسجد میں یہ خدمت انجام دی، غالباً ۱۳۰۰ھ میں آپ کا وصال وہیں ہوا اور ائمہ حرم شریف کے قریب قبرستان میں دفن ہوئے۔ اس وقت آپ کا سن شریف ستر برس کا تھا۔

شاہ عبدالحی کثیر التصانیف بزرگ تھے، تصانیف کی تعداد عموماً سوا سو کی بتائی جاتی ہے۔ اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تصانیف سو سے تو کم نہ تھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر شائع ہو چکی ہیں۔ بیبیر شریف کے علاوہ کئی اور کتابیں متعدد بار چھپی ہیں، شاید چار یا پانچ ہی کتابیں اشاعت سے رہ گئیں، بیبیر شریف کے علاوہ چند اہم

تصانیف کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ خطبات حرمین الشریفین، یہ سال بھر کے لئے خطبات جمعہ کا مجموعہ ہے۔ سیر شریف کے بعد مصنف کی یہی کتاب بار بار چھپی اور ہاتھوں ہاتھ بکی ہے جنوبی ہندوستان کی مسجدوں میں عموماً اور ریاستِ میسور کی مسجدوں میں خصوصاً ستر اسی برس سے یہی خطبے پڑھے گئے اور شمالی ہند میں بھی ان خطبوں کا کافی استعمال رہا ہے، اس مجموعے میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے دو چار خطبے ضرور لکھ کر شامل کئے ہیں لیکن باقی سب خطبے ابن نباتہ مصری کے مقفیٰ اور مسجع عربی خطبات کا اردو میں منظوم ترجمہ ہیں۔ ابن نباتہ حلب کے امیر سیف الدولہ کا درباری ادیب تھا جس کے خطبے ہندوستان میں بہت مقبول رہے ہیں، یہ اردو میں جمعہ کے خطبوں کا پہلا مجموعہ ہے، اس سے پہلے نہ جنوبی ہند میں کوئی ایسا مجموعہ منظر عام پر آیا نہ شمالی ہند میں، فیض الباری، شرح صحیح بخاری اردو میں۔ بخاری شریف کا پہلا ترجمہ اور شرح ہے، یہ شاہ صاحب کی آخری تصنیف ہے، عبادات تک کا ترجمہ اور شرح اس میں آگئی ہے، مصنف سفر حج کی وجہ سے اسے پایۂ تکمیل پر نہ پہنچا سکے۔ "حدیقۃ الاحباب" اردو نثر میں خلفاء اربعہ کا پہلا مکمل تذکرہ ہے، حدیقۃ الابرار، آل رسول صلعم کا تذکرہ، روضۃ الابرار، اس میں بارہ امام کے حالات لکھے ہیں۔ شرح سر الشہادتین، یہ سیر شریف کی طرح ابا ہین شہیدین کا منظوم شہادت نامہ ہے۔ یہ کتاب بھی متعدد مرتبہ چھپی اور عشرہ محرم میں اس کی پڑھائی کا رواج برسوں سے برابر جاری ہے۔ فوائد قدسیہ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا تذکرہ، چہار گلشن، فقہ کے ائمہ اربعہ کا احوال، قرآن السعدین، زن و شوہر کے باہمی تعلقات اور ازدواجی زندگی کے آداب، حقوق المومنین، مومنوں پر جو مختلف اور متعدد حقوق ہوتے ہیں ان کی مفصل بحث، تحقیق الشفاعۃ، شفاعت کے متعلقات پر بحث، کلید معرفت، تصوف و سلوک پر مختصر سا رسالہ، تنبیہ العلوم، بدعات کے خلاف ایک عالمانہ وعظ، دیوان، حضرت شاہ صاحب کا نعتیہ کلام، سیوطی کی تاریخ الخلفاء، عطار کی تذکرۃ الاولیا، غزالی کی زادالآخرہ کا ترجمہ۔

شاہ عبدالحی کی اکثر تصانیف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ ان موضوعات پر اردو میں نقشِ اول کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے ملک بھر میں اتنی مشہور اور مقبول ہوئیں۔ دوسرے یہ کہ سب تصانیف عالمانہ اور محققانہ ہیں، عامیانہ یا غیر معیاری نہیں، کیوں نہیں، آپ خود ایک جید عالم تھے، قدرت نے طبیعت میں تخلیق کا مادہ ودیعت کیا تھا جو لکھا تحقیق کی بنا پر لکھا اور نئے رنگ اور نئے انداز میں لکھا، آپ جنوبی ہند میں گویا اسلام کے بہت بڑے مبلغ تھے، عمر بھر وعظ و نصیحت کرتے پڑھتے اور پڑھاتے رہے اور اتنی بڑی تعداد میں ایسی قیمتی کتابیں لکھیں جن سے عوام و خواص فائدہ اٹھاتے رہے۔ اگر آپ کا وجود نہ ہوتا اور آپ کی خدمات وقوع میں نہ آتیں تو کیا ہوتا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک صدی بھر ریاستِ میسور کے مسلمانوں نے خصوصاً اور جنوبی ہند کے مسلمانوں نے عموماً آپ کی تصانیف سے خدا اور رسول کے احکام کا علم حاصل کیا ہے، اب ان کی زبان کچھ پرانی ہوچکی ہے تاہم افادیت اور استعمال میں آئندہ بھی شاید کوئی کمی نہ آئے گی، اردو ادب کی تاریخ میں آپ کا نام آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے اردو نظم و نثر میں آپ نے اتنی وقیع، مفید اور کارآمد کتابیں اتنی کثرت سے لکھیں، اردو کے رواج میں اتنا زبردست حصہ لیا اور اردو بولنے والوں کی ضرورتیں ایسی خوبی کے ساتھ پوری کی ہیں۔

جنان السیر شاہ صاحب کا شاہکار ہے، یہ ایک بڑی ضخیم منظوم کتاب ہے، میرے سامنے اس کا وہ نسخہ ہے جو غلام محمد شوکت صاحب نے ۱۳۲۹ھ میں اپنے مطبع شوکت الاسلام بنگلور سے شائع کیا تھا، یہ وہی نسخہ ہے جو شاہ صاحب کے فرزند عبدالقادر علی صاحب صوفی کی تصحیح و تنقیح سے مرتب ہوا تھا، تصنیف کے وقت شاہ صاحب کے سامنے علامہ باقر آگاہ مدراسی کی ہشت بہشت تھی۔ اس کا اعتراف خود شاہ صاحب نے جنان السیر کی ابتدا میں کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ انہوں نے چوں کہ سرورِ کائنات کے مبارک حالات مختصر لکھے ہیں۔ اس لئے میرے بعض احباب نے یہ شوق ظاہر کیا ہے کہ میں اس اجمال کی تفصیل لکھوں

چنانچہ میں نے اس کتاب کے چار چمنوں میں حالات مبارکہ بیان کئے ہیں۔ تاہم بادی النظر میں واضح ہوجاتا ہے کہ ہشت بہشت اور جنان السیر کی زبان اطرز بیان، موضوعات اور مطالب وغیرہ میں فرق ہے، شاہ صاحب نے اپنے مآخذ کی فہرست بھی دی ہے جن میں سے چند اہم یہ ہیں، فتح العزیز، شرح مشکوٰۃ شریف، ماثبت بالسنہ۔ مواہب علیہ، روضۃ الاحباب، معارج النبوہ، شواہد النبوہ، مدارج النبوہ، شاہ صاحب نے علامہ مدراسی کی بڑی تعریف کی ہے اور سبب تصنیف یہ بتایا ہے کہ عربی اور فارسی میں تو سیرت کی بہت سی کتابیں ہیں مگر ہندی یعنے اردو میں بہت کم، چنانچہ آپ نے اردو میں ایک ایسی کتاب پیش کی جس سے عوام اور خواص دونوں استفادہ کرسکیں۔

جنان السیر کے نام کی مناسبت سے ابواب کو چمن کہا گیا ہے، اس کے دو دفتر ہیں، پہلے دفتر کا نام جنان السیر فی احوالِ سید البشرؐ ہے اور دوسرے کا نام جنان السیر فی فضائل سید البشرؐ، پہلے دفتر میں چار چمن ہیں دوسرے دفتر میں پانچ، پہلے سات چمن شاہ صاحب نے اور باقی چمن آپ کے کہنے پر آپ کے فرزند عبدالقادر علی صوفی نے لکھے ہیں۔ جملہ بیس ہزار سے زائد ابیات ہیں، ان میں سے اٹھارہ ہزار سے زیادہ شاہ صاحب کے ہیں باقی دو ہزار کے لگ بھگ آپ کے فرزند کے۔ دوسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور آٹھویں چمن کے آخر میں سال تصنیف دن اور مہینے کا نام بھی بتایا ہے۔ تیسرے اور چوتھے چمنوں کے درمیان ایک تکملہ اور ایک ضمیمہ شامل ہے۔ دو چار جگہ ابیات کی تعداد بھی لکھی ہے، دوسرے اور ساتویں چمن کے اختتام پر اپنی عمر بھی بتائی ہے۔ شاہ صاحب بہت پر گو تھے، ساتویں چمن جس میں جملہ تین ہزار ابیات ہیں، رمضان میں شروع کیا اور عرفے کے دن مکمل کرلیا ہے، اس طرح ساری کتاب نظم کرنے پر بہت کم مدت صرف ہوئی، پہلے دو چمن ۱۲۶۵ھ میں تیار ہوئے جب شاہ صاحب کی عمر تیس برس کی تھی، ان کی ایک جلد میں اشاعت کئی مرتبہ ہوئی پھر دس برس تک شاہ صاحب اس کی طرف توجہ

نہ کر سکے، شاید دوسری تصانیف پر لگے رہے، ۱۲۷۵ھ میں احباب اور شائقین نے بہت اصرار کیا تو چند ہی مہینوں میں اور دو چمن لکھ کر پہلا دفتر پورا کر دیا، پندرہ سولہ برس تک یہ ایک ہی دفتر جنان البیر کے نام سے طبع ہوتا رہا، ۱۲۹۱ھ میں آپ نے دوسرے دفتر کے تین چمن خود لکھے اور باقی چمن اپنے فرزند سے لکھائے۔ اس طرح دوسرا دفتر مکمل ہوا اور دونوں دفتر ایک ضخیم جلد میں شائع ہونے لگے۔

کتاب کا آغاز بنگلور کے مشہور فارسی دان اور شاعر قلندر حسین اطہر کے دیباچے سے ہوا ہے، آپ نے بڑی فصیح و بلیغ داز نوں اور قطعوں میں کتاب مصنف اور قطب ویلور کی تعریف لکھی ہے۔ آپ کے یہ ابیات پر لطف ہیں

خوب پڑھتے ہو میاں مثنوی فسانی :: عرش اورنگ شاہ کا قصہ دیکھو
مثنوی میر حسن کی اجی پڑھنے والے :: کسی محفل میں یہ پڑھ کر تو رکا جلوا دیکھو
داستاں ہے یہ مگر اپنے رسول اللہ کی :: تم بھی اطہر پڑھو یا اس کو سنو یا دیکھو

جنان البیر کی زبان بالکل سیدھی سادھی اور نہایت ہی عام فہم ہے۔ اس عہد کے جنوبی ہند کی عام زبان کا بہترین نمونہ ہے، طرز بیان میں نہ کوئی رنگینی ہے نہ پیچیدگی... ہر شخص بآسانی سمجھ لیتا ہے اور یہی مصنف کا مقصد تھا، آپ نے شاعری نہیں کی، حالات اور واقعات کے بیان کو دل نشین بنانے کے لئے فقط نظم سے کام لیا ہے۔

خود فرماتے ہیں ؎

ہے مجھے مقصود کہ سمجھیں عوام :: شعر کی ہرگز نہ نزاکت سے کام

ہر چمن ایک مختلف بحر میں ہے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب نے سارے مطالب قرآن و حدیث سے اخذ کئے ہیں اور جگہ جگہ ان کے حوالے دئے ہیں۔ کوئی بات بلا تحقیق و تصدیق نہیں لکھی، جو مطالب اور ماخذ سے حاصل کئے ہیں ان کے حوالے بھی دئے ہیں۔ شاہ صاحب جا بجا علامہ باقر آگاہ کا ذکر تعریف کے ساتھ کرتے ہیں

آپ کے مطالب اکثر مدارج النبوۃ سے لئے ہوئے ہیں، اس کا آپ نے متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا یہ بیان بھی آپ نے فیوض الحرمین سے نقل کیا ہے کہ آپ نے مکہ معظمہ میں ماہِ ربیع الاول میں وہاں کی محفلِ میلاد میں شرکت کی۔ اس محفل میں آپ نے عجیب انوار ملاحظہ فرمائے، آپ پر یہ حقیقت کشف ہوئی کہ یہ ملائکہ کے انوار ہیں جو اس مبارک محفل میں شریک ہوتے ہیں۔

مولوی رومیؒ کی مثنوی کو کسی نے "ہست قرآن درزبان پہلوی" کہا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ سیر شریف کو ہم "زبانِ اردو میں ہے یہ قرآن" نہ کہیں۔ اس میں ایمان و اسلام کے اتنے مطالب آگئے ہیں کہ قرآن مجید کے بعد ایک مسلمان کے لئے یہی ایک کتاب کافی ہے، یہ شاہ عبدالحی بنگلوری کا اردو پر اور اردو بولنے والے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

نگارشات بوعلی بزبان فارسی

شیخ الرئیس ابوعلی سینا که یک هزار سال پیش، معاصر ابوریحان البیرونی و سلطان ابوسعید ابوالخیر بود، یکی از بزرگ‌ترین فلاسفهٔ عالم و سرآمد حکماء اسلام بشمار می‌آید، معارف اسلامی بوجود او می نازد و ذخیرهٔ علمی آن دانشمند مایهٔ افتخار مسلمین است، دسترسی که بوعلی در علوم و فنون آن زمان داشت از نظر تازگی و جدت فکر نظیر آن در دیگران کمتر دیده می شود، و می توان گفت که علوم و فنون مختلفه در او جمع شده بود، و تالیفات او بیشتر از یک صد می باشد که در هر زمان مرجع اهل تحقیق بوده است مخصوصاً تالیفات او در طب و حکمت اهمیتی بسیار دارد و استادی و هنرمندی وی در آن جا روشن است بوعلی دارای ذوق ایجاد و اختراع هم بوده و شهرتش گزشته از مشرق در مغرب زمین هم رسیده - یکی از مهم‌ترین تالیفات او که باسم قانون شهرت دارد نه تنها در طب مشرق بلکه در طب مغرب هم دارای رتبهٔ بلندی و درجهٔ بزرگی است همین طور کتاب شفاء او در فلسفه اهمیت و ارزش بسیار دارد

این حکیم بزرگ و مفکر عالی مقام از اهل ایران بوده، پدر و مادرش هر دو ایرانی بودند و زبان شان زبان فارسی بوده،

پدرش از اهلِ بلخ و مادرش از اهل دهکده‌ای در اطراف بخارا بودند و در نواحی بخارا زندگی میکردند بوعلی در آنجا بوجود آمد و از آغاز جوانی بتحصیل علوم و فنون پرداخت، و از بخارا بگرگانج رفت و از آنجا بطوس و نیشاپور و گرگان و اصفهان رفت، و در آخر عمر در همدان آمد چندی در آنجا زندگانی کرد در همان جا پدرود زندگانی کرد.

بوعلی با این که بیشتر تالیفات او بزبان عربی است در خانه و جامعه و دربارهای شاهان بزبان فارسی که زبان عمومی و تکلمی ایران آن زمان بوده صحبت میکرد، و همچنین بزبان فارسی به نظم و نثر میپرداخت، پس باید که او را شاعر و نویسنده زبان فارسی هم بدانیم و مقام او را بشناسیم.

در آن دوره که بوعلی زندگانی می کرد زبان علمی و ادبی ایران و دیگر کشورهای اسلامی عربی بوده و با اینکه بعضی از علمای ایران بزبان فارسی سخن میراندند، تالیفات و مراسلات شان بیشتر بزبان عربی بوده مردم در یاد گرفتن زبان عربی می کوشیدند و قدرت و مهارت را در آن زبان موجب افتخار خود می دانستند.

اما تحولاتی بوجود آمد و زبان فارسی رواج بیشتری پیدا کرد باز هم زبان عربی اهمیت خود را از دست نداد و درجهٔ علمی خود را حفظ کرد، و از اینکه بوعلی در اواخر دورهٔ سامانی و آل زیاری زیست، و از اینکه آن دوره دورهٔ آغاز نظم و نثر بزبان فارسی بوده، دانشمندان آن زمان تالیفات خودشان را بیشتر بزبان عربی ترتیب می دادند. ما در اینجا به نظم و نثر بوعلی که بزبان عربی می باشد علاقه نداریم،

تنها نگارشات او را که بزبان فارسی است مورد بحث قرار میدهیم
چنانکه به نظر می آید بیشتر تالیفات بوعلی از میان رفته
زیرا که زندگانی او بیشتر به سفر و سیاحت گذشت، وی اغلب کتب
خود را به سفر و بنا برخواهش دوستان خود نوشت - هرکسی که نزد
وی خواهش کرد کتابی برای او نوشت و باو داد، و برای خودش
نقلی یا نسخه ای از آن نگرفت - محققین ازوپا و ایران و مصر
کتاب های او را جمع آوری و حفظ کرده اند و بعضی از آنها را بچاپ
رسانیده اند.

تالیفاتی چند در زبان فارسی که به شیخ منسوب اند بما
رسیده اند که یکی از آنها دانش نامهٔ علائی است، و دیگری قراضهٔ
طبیعیات، و کتاب سومی رسالهٔ نبض است و از سبک نویسندگی این
کتاب ها پیداست که نوشته بوعلی می باشد و مختصات نثر فارسی
آن دوره که در تاریخ طبری و قابوس نامه و کشف المحجوب و تذکرة
الاولیا دیده میشود در آنها موجود است

کتاب دانش نامهٔ علائی که بنام حکمت علائی هم
معروف است کتابی مهم تر از قراضهٔ طبیعیات و رسالهٔ نبض میباشد
و این کتابی است مختصر که اهمیت آن بسیار می باشد، بوعلی
این کتاب را در آغاز قرن پنجم هجری در اصفهان به فرمان
علاء الدوله نوشت و باسمش موسوم کرد، گویند که این کتاب از
میان رفته بود ولی یکی از شاگردان شیخ که ابو عبید الله نام داشت
وصیت و پنج سال در خدمت او بوده پاره های آنرا بزحمت جمع کرد

وقسمت های که نتوانست بدست آورد از کتاب های دیگر او که بزبان عربی بودند از آنها ترجمه نموده بآن پیوست وکتاب راتمام کرد- جلد اول این کتاب که مشتمل بر منطق و الهیات است باراول درسنه ۱۳۰۹ھ در مطبع فیروز حیدرآباددکن، بچاپ رسید- ولی این چاپ اغلاط بسیار داشت، باز درسنه ۱۳۱۰ھ استاد احمد بهمنیار (۱) آنرا به تصحیح وترتیب نوین و بحواشی مفیده آنرا درتهران بچاپ رسانید، این نسخه از نسخه های دیگر که تاحال بچاپ رسیده است خوبتر و بهتر می باشد- دانشنامهٔ علائی مشتمل بر دو جلد است- جلد اول متضمن مقدمه وقسمت منطق والهیات است وجلد دوم مشتمل بر ابواب هندسه وهیئت وریاضی وموسیقی می باشد- با این که موضوعات این کتاب علمی است ومطالعه کننده راخسته میکند باز هم قریحه وشیوهٔ نویسندگی بوعلی آنرا جالب ساخته است، بوعلی این کتاب رابسبک بسیار ساده وآسان درآورده است ومی توان گفت که این کتب بر دیگر کتاب های حکمت وفلسفه که تاحال بزبان فارسی نوشته شده است دارای فوقیت می باشد- اینک نمونه ای از عبارت این کتاب-

"باز نمودن غرض درعلم منطق و فائده اندروی

دانستن دو گونه است، یکی اندر رسیدن کی بتازی تصور آن را خوانند چنانک اگر کسی بگوید مردم یا پری یا فرشته و هرچ بدین ماند تو فهم کنی و اندر یابی کی بدین چه می خواهد-

و دوم گروبدن چنانک بگروی کی پری هست و مردم زیر فرمانست و هرچ بدین ماند اورا بتازی تصدیق خوانند-

(۱) اکنون مرحوم شده

ذاین ہر دو دو گونہ است، یکی آنست کی باندیشہ شاید اندر یافتن و چارہ نبوذ کی اورا بہ طلب از راہ خرد بشاید بجای آوردن چنانک اندر رسیدن بچہ چیزی روان و تصور کردن وی و چنانک گرویدن بنا مردان روان و تصدیق کردن بوتا۔

دیگر آنست کی اورا اندر یابیم و بوی بگرویم نہ از جہت اندیشہ و نہ بطلب خرد بلک باول خرد دانیم چنانک دانیم کی ہر دو چیز کی برابر باشند با یک چیز کی ہر یکی چند وی بوند یک با دیگر نیز برابر بوند یا بحس چنانک دانیم کی آفتاب روشنست یا بذیرفتہ باشیم از بزرگان و دانایان چنانک از صاحب شریعتان و امامان یا چیزی باشد کی اتفاق مردم بروی بوذ و برورش ما بروی بوذہ باشد چنانک گوئیم دروغ زشتست وستم نباید کردن یا برروی دیگر از رویہا کی سپستر یاذ کردہ آیذ''

واینک پارہ ای از رسالۂ قراضۂ طبیعات کہ از حیث عبارت ولغات وسبک میتوان آنرا الشیخ نسبت دلو:

'' آغاز سخن'' ہمت امراء و ملوک آنست کہ شغل ہا کی خوانند کی شہر کشا ذن یذان بوذ و ولایت گرفتن و خزائن و اموال جمع کردن و ہرچ نفیس تر و شریف تر از آن مالہا چون جواہر و ظرایف خویشتن را ذخیرہ کنند تا بداں استمتاع این ہا نی گیرند و این چنین حال ہر چند نیکوست آخر گزرندہ است و سریع زوال و امیر رئیس اجل ما از ہمت ہمتی ازین بزرگ تر ضم کردہ است و آن آنست تا می خواہذ کی ہرچ اندر جہان انواع علوم ست نزدیک

خویش حصر کنند و آن گاہ تمیز صاحب خویش بر دگمارد تا آنچ از طرف و نوادرست خویشتن را حاصل کنند تا بدان او را استمتاع و سعادت آن جہانی باشند و خدای جل و علا او را توفیق دہاد بدآن۔

و چون اندر مجلس شریف ادام اللہ شرفہ حدیث طبیعیات و کتب ارسطاطالیس اندرین باب ہمی رفت بفرمود این خادم را تا کتابی کنند اندر مسائل طبیعی بر طریق سوال و جواب بپارسی تا فائدہ آن عام باشند۔

این خادم آن مثال را امتثال کرد و قصد کرد تا از آنچ دیگران بگفتہ اندر اندرین کتاب نیارد مگر چیزی کی آن را مقدمۂ سازد مسئلہ دیگر را و یا بر سبیل اتفاق اندر افتند و این کتاب را موسوم کردم بقراضۂ طبیعیات،،

درین شکی نیست کہ رسالۂ نبض را بوعلی بقلم خود نوشتہ است و بقول ملک الشعراء بہار نسخۂ خطی این رسالہ در کتاب خانۂ آقای سید محمد مشکوٰۃ موجود است کہ در کہنگی آن نمیتوان شک کرد۔ اینک عبارتی از این رسالہ :

"باول بباید دانست کہ آفریدگار ما کہ حکمت وی داند و مر دانش جویان را از آن اندکی آگاہی دادہ است، چہار گوہر اصلی کہ اندرین عالم زیر آسمانست بیافرید یکی آتش و یکی ہوا و یکی آب و یکی خاک تا از ایشان بکمابیش آمیزشی چیزہای دیگر آفریند چون ابر و باران و سنگ و گوہر گداختن پذیر و گوہر روبیندہ و گوہر شناسندہ بحس و گوہر مردم، ہر یکی را وزنی دیگر از آن چہار گوہر اصل و آمیزش

دیگرگونه و آتش را گرم آفرید و از خشکی بهره داد و هوا را تر آفرید و
گداخته و از گرمی بهره داد و آب را سرد آفرید و از تری بهره داد و
خاک و زمین را خشک آفرید و از سردی بهره داد۔

معتدل آمیزشی ازین چهاران مردم بود و مردم را از گرد
آمدن سه چیز آفرید یکی تن که وی را بتازی (بدن) خوانند و جسد و دیگر جان که
وی را روح خوانند و سیوم روان که وی را نفس خوانند"

کتاب های دیگری هم بزبان فارسی هستند که آن را به شیخ
نسبت میدهند ولی سبک و لغات آنها بطوریست که میتوان قیاس کرد
شیخ آنها را بعربی (نوشته و دیگران آنها را بفارسی در آورده اند) میسازند که سبک دورهٔ سامانیان است با اینکه بوعلی
استادی بود زبردست و در هر دو زبان عربی و فارسی کتابها مینوشت
ولی مانند نویسندگان دیگر ما بعد عبارت فارسی او بی آمیزش هست و لغات
تازی بزبان او بغایت کم است، جائی شگفت است که بهر دو زبان تسلط
داشت و فارسی بی آمیزش مینوشت و اگرچه در مقدمات و خطبات بعضی
کتاب های خود از استعمال لغات عربی خود داری نکرده است باز هم در
متون آنها تا حد امکان لغات فارسی بکار برده است و الفاظ عربی
بیش از صدی پنج تجاوز نمی کنند۔

در مورد اسلوب نویسندگی ایجاز و اختصار بوعلی در خورد
اعتنا و ستایش است در هیچ جای الفاظ مترادف و جمله های هم معنی
بکار برده نشده است، بنابراین در جاهای عیب تعقید دیده میشود،
بوعلی نثر روان و ساده می نوشت، جمله های او کوتاه و مختصر اند و
مطالب واضح و روشن و میتوان گفت که سبک بوعلی بی نهایت ساده

قشنگ وزیبا می باشد - بوعلی در نوشته های خود لغات فارسی قدیم را هم بکار برده است او خط واملائی زبان خود را نیز حفظ نموده است مثلاً های مختفی که در آخر الفاظ می آید . تلفظ نمی شود وتنها از برای اظهار حرکت ماقبل باشد چون بلک، زیراک، هرک، چنانک، آنچ، هرچ که را بجای چه را بصورت کی وچی .

قاعده دال آن بود که محقق طوسی در این رباعی بیان کرده است، آنانکه بپارسی سخن می رانند . درمعرض دال ذال رانشانند ماقبل وی ارساکن جز وای بود . دالست وگرنه ذال معجم خوانند، دالی که درمیان الفاظ یا در آخر کلمات می آید با نقطه نوشته می شد ولی دال اول کلمه همیشه مهمله می بود .

الف " است " پس از حروف منفصله نمی نوشتند چون اعامز ست، واست، را با کلمه ای که بہ های مختفی ختم شود مدغم می کردند، مثلاً گفتست، آمدست، رفتست وغیرہم .

افتادن را " اوفتادن " می نوشتند وبجای جیم فارسی همیشه جیم تازی می آوردند همین طور بجای بای فارسی درهرجا بای تازی می آوردند " ایدر " بجای این جا و " ایدون " بجای چنین و " اندر " بجای " در " بکارمیبردند

صرف ونحو درزبان بوعلی هم خصائصی داشت، مثلاً استعمال بای زائده باوّلِ ماضی منفی چون " بنگفت " رواج داشت وهمچنین مصادر مرکبه در استعمال بوده نه مصادر سماعیه، مثلاً " جنگ کردن " و " رقص کردن " و " طلب کردن " جمع ' داناوبینا " داناآن " و " بیناآن " میبود .

ازمهم ترین خدمات بوعلی بزبان فارسی اینست که وی گاهی

مصطلحات را بزبان فارسی بصورت ترجمه در آورده است و گاهی مصطلحات فارسی را بطور توضیح بکار برده است۔ اینک فهرست مختصری است از مصطلحات فارسی که در برابر مصطلحات عربی در نوشته های بوعلی بنظر می رسد۔

تصور	اندر رسیدن	علم طبعی	علم زبرین
تصدیق	گرویدن	ماده	مایه
فکر	اندیشه	ریاضی	انگارش
تمییز	جدائی	تغیر	گردش
فعل	کنش	موجد	هستی ده
علم الٰهی	علم برین	ثقل	گرانی
ماهیت	چه چیزی	تقدم	پیشی
کمیت	چندی	تاخر	سپسی
کل	همگی	طول	درازا
جزء	پارگی	عرض	پهنا
مثلث	سه سو	عمق	ستبرا
ضلع	پهلو	عرضی	بیرونی
طب	پزشکی	مربع	چهار سو
الم	پتمرائی	بارادہ	بخواست
الذ	هامتی	کیفیت	بچگونگی
نفس	جان	علت	بچرائی
فرع	شاخ	کثرت	بسیاری
ترکیب	آمیزش	سکون	آرامش

امکان	شایست	حرکت	جنبش
قاطع	برنده		
اتصال	پیوستگی		
انفصال	گسستگی		
این	کجائی		
متی	کبی		

بوعلی بزبان فارسی شعر می سرود و اشعار او بما رسیده است اما اشعار فارسی او در زیبائی وقشنگی آنطور نیست که بزبان عربی میباشد گمان میرود که اشعار او بیشتر ازمیان رفته، مستشرق آلمانی دکتر اینی بزحمت تمام درگرد آوردن دوازده رباعی ویک قطعه و دو غزل موفق شده است و آن را بشیخ نسبت داده است وبا ترجمه در زبان آلمانی در سنه ۱۸۷۵ء چاپ نموده است این مجموعه دارای بیشتر از چهل شعر نیست. پرفسور براون مستشرق انگلیسی در صحت و اصالت این اشعار شک دارد. اینک چهار رباعی از سخن بوعلی.

دل گرچه درین بادیه بسیار شتافت
یک موی ندانست ولی موی شگافت
اندر دل من هزار خورشید بتافت
آخر بکمال ذره‌ای راه نیافت

از قعر گل سیاه تا اوج زحل
کردم همه مشکلات گیتی را حل

بیرون جستم ز قید هر مکر و حیل
هر بند کشاده شد مگر بند اجل

ای کاش بدانمی که من کیستمی
سرگشته بعالم از پی چیستمی
گر مقبلم آسوده و خوش زیستمی
ورنه بهزار دیده بگریستمی

کفر چو منی گزاف و آسان نبود
محکم تر از ایمان من ایمان نبود
در دهر چو من یکی و من هم کافر
پس در همه دهر یک مسلمان نبود

رباعی چهارم را بعمر خیام هم نسبت میدهند ولی از فرجه و سبک آن پیداست که مال بوعلی میباشد. بعضی از رباعیات دیگر فارسی بوعلی همین طور مورد شک و انتقاد است

بوعلی اشعار ذیل را در مدح شراب گفته است :-

بطعم تلخ چو پند پدر و لیک مفید
بنزد مبطل باطل بنزد دانا حق
حلال گشت باحکام عقل بر دانا
حرام گشت به فتوای شرع بر احمق

شراب راچہ گنہ گرچہ ابلہی نوشد
گہی بہ تیغ برد دست گہ سوی بنجق
چو بوعلی می ناب ار خوری حکیمانہ
بحق حق کہ وجودت بحق شود ملحق